پشکن کے دیس میں

جگن ناتھ آزاد

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

جگن ناتھ آزاد

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلی بار دسمبر ۱۹۸۶ء | تعداد 750 | قیمت =/25

لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹرز: مکتبہ جامعہ، لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

اندر کمار گجرال

کے نام

جن کے فکر و نظر میں

ہندروس دوستی کی تابناک تصویر نظر آتی ہے

یاسناپالیانا میں تالستائی
کا
مکان
سنہ ۱۹۰۸ء

فہرست
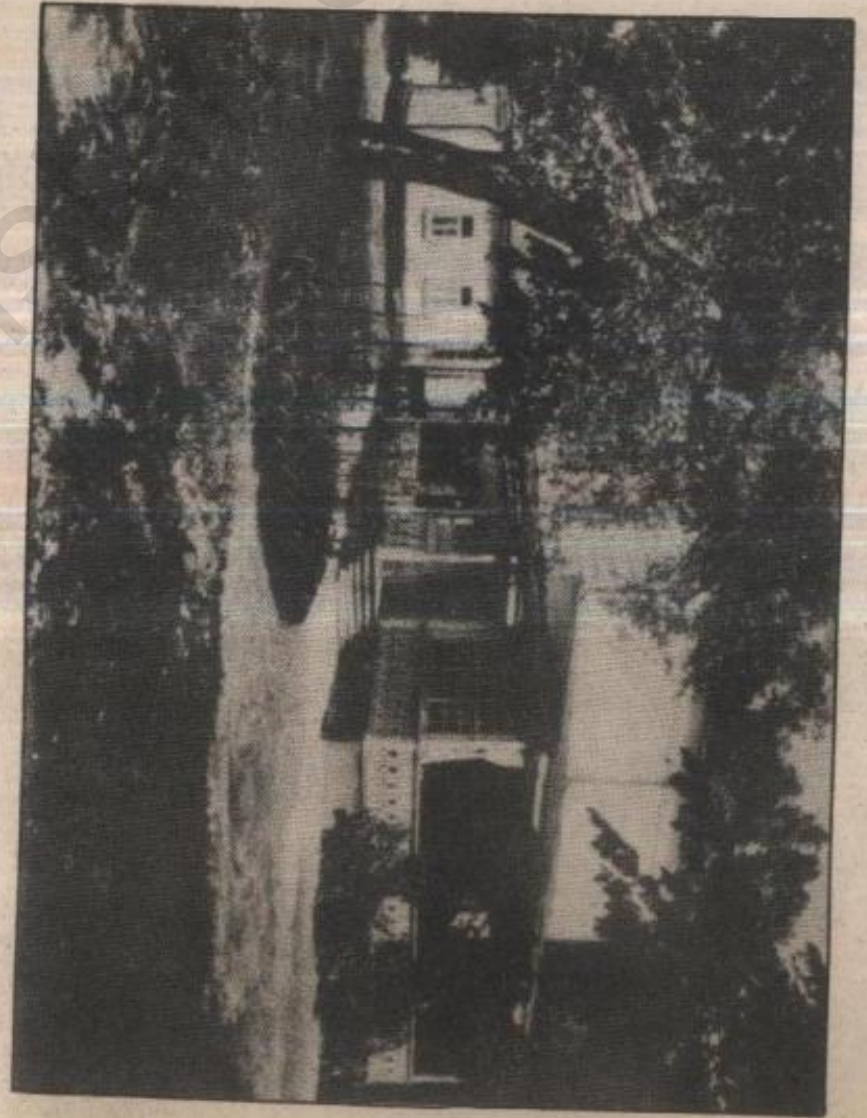
حرفِ اوّل

روس ایک عظیم ملک ہے۔ اس کی عظمت اور اس کے کارہائے نمایاں کی ایک جھلک میں اپنے لڑکپن میں پریم چند کی تحریروں میں بھی دیکھ چکا تھا اور رابندرناتھ ٹیگور کی نگارشات میں بھی، جواہر لال نہرو کے تاثرات میں بھی اور حسرت موہانی کی شاعری اور نثر میں بھی، راجا مہندر پرتاپ کے افکار میں بھی اور علامہ اقبال کے کلام میں بھی اور یہ جھلک دیکھنے کے بعد میری دلی آرزو تھی کہ میں اس سرزمین کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ آخر میری یہ آرزو پوری ہوئی اور ۱۹۷۶ء میں مجھے اس دیارِ انقلاب اور دیارِ علم و فن کے سفر کا موقع ملا۔

اگرچہ میرا یہ سفر خاصا مختصر تھا، صرف اکیس دن کا (۳ ستمبر سے ۲۴ ستمبر تک) اور میں سارے ملک کو — شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک — نہ دیکھ سکا لیکن جتنا کچھ بھی دیکھا اُس سے اِس سرزمینِ شعر و ادب اور دیارِ علم و حکمت کے نقوشِ عظمت میری زندگی کا ایک سرمایہ بن گئے۔

میں نے روس میں جو کچھ دیکھا اس کا ایک مختصر سا ذکر آئندہ صفحات میں درج ہے۔ یہاں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ علم و فن کی قدر کا ایک بہت اونچا معیار مجھے اس ملک میں دیکھنے کو ملا۔ بازاروں میں خریداروں کے لمبے لمبے کیو (Q) یہاں آلو، پیاز اور مٹی کے تیل کی دکانوں پر نظر نہ آئے بلکہ کتابوں کی دکانوں پر نظر آئے۔ یہاں وہ بھوک اور پیاس نہیں ہے جو مشرق کے اکثر ملکوں کا مقدر بن چکی ہے بلکہ علم کی تشنگی ہے، کتابوں کی پیاس ہے اور کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہی فوراً اپنے مشتاق کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہیں۔ مستند اور بلند پایہ مصنفوں کا مرتبہ یہاں صحیح معنوں میں دوسرے ملکوں کے لیے قابلِ رشک ہے۔ علامہ اقبال کے پایے کا شاعر روس میں پیدا ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ عمر کے آخری حصے میں کسی قدردان والیِ ریاست کی طرف سے پانسو روپے ماہانہ کی اسے ضرورت ہوتی یا عمر کے اس حصے میں وسائل کی کمی کے باعث اس کا خاطر خواہ علاج نہ ہو سکتا۔ یا پریم چند کے پایے کا ادیب روس میں ہوتا تو اس صورتِ حال کا تصور ہی غیر ممکن تھا جس افلاس زدہ صورتِ حال میں یہ عظیم فن کار اس دنیا سے رخصت ہوا۔

میرا یہ سفرنامہ چوں کہ سیاست یا صنعت و حرفت سے متعلق نہیں ہے اس لیے اس

میں اس طرح کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے کہ روس نے ہندستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کی ایک مستحکم بنیاد قائم کرنے کے لیے کتنے خلوص سے کام لیا ہے یا ہندستان میں صنعتی ڈھانچے کو پختگی اور پائندگی دینے کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ یہ ایک شاعر کا سفرنامہ ہے اور بڑی حد تک "نظرے خوش گزرے" کی ایک تفسیر ہے جس میں زیادہ تر ذکر شعر و ادب یا یونیورسٹیوں کی فضا کا نظر آئے گا۔ لیکن یہ ذکر بھی اتنا مفصل نہیں ہے کہ اس پر کسی ادبی، علمی یا تعلیمی دستاویز کا گمان ہو۔ میں تو ایک طرح سے بس

"گزرا چلا گیا ہوں دیارِ حبیب سے"

روس کے اس علمی اور ادبی پہلو کی کسی حد تک تفصیل درشن سنگھ کی کتاب "سوویت یونین: آج اور کل" (مطبوعہ نئی دہلی ۱۹۷۷ء) میں نظر آتی ہے[1]۔ چنانچہ اسی رعایت سے میں مشرق و مغرب کے عظیم شاعر علامہ اقبال کے چند اشعار کے ساتھ یہ سفرنامہ اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں

---

[1] اِس کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو: سوویت یونین کے عوام کتابوں کے بے حد شائق ہیں اور اس طرح ان کے ملک میں مطالعے کے شائق عوام کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ سوویت یونین میں ہر سال ایک لاکھ نئی کتابیں چھپتی ہیں جن کی جلدوں کی مجموعی تعداد ۱۵ کروڑ تک پہنچتی ہے۔ صرف گزشتہ سال دو سو چھتیس اشاعتی اداروں کی طرف سے ۸۰ کروڑ کتابیں اور کتابچے شائع کیے گئے۔ یہ کتابیں سوویت یونین اور دیگر ملکوں کی تقریباً ۱۴۵ زبانوں میں چھاپی جاتی ہیں۔ ایک تخمینے کے مطابق سوویت اقتدار کے برسوں میں سوویت یونین میں مختلف کتابوں کی ۳۹۵۰ کروڑ جلدیں چھاپی گئیں۔

اشاعت، طباعت اور کتابوں کی تقسیم سے متعلق سوویت یونین کی ریاستی کمیٹی کے چیرمین بی استنکاپین نے ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۵ء تک کے دوران میں کمیٹی کے مقررہ نشانوں کی تکمیل کا خلاصہ پیش کیا ہے جنھیں سال کے ختم ہونے سے قبل ۱۲ نومبر ۱۹۷۵ء ہی کو پورا کر لیا گیا۔ دی۔ مائر کنگ۔ ۲ ستمبر ۱۹۷۶ء ان کی مذکورہ تحریر کے مطابق اِس مدت کے دوران میں کتابوں اور پمفلٹوں کی تقریباً ۸۰۰ کروڑ جلدیں چھاپی گئیں جو گزشتہ پانچ برس کی مدت کے مقابلے میں ۱۵۰ کروڑ زیادہ تھیں۔ ۲۸۰ کروڑ روبل کی کتابیں عوام کو فروخت کی گئیں۔

سوویت یونین میں غیر ملکی مصنفین بھی کافی مقبول ہیں اور ان کی تصانیف کے متعدد تراجم شائع کیے جاتے ہیں۔ یونیسکو کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۴۶ء سے ۱۹۷۲ء تک سوویت یونین میں امریکی مصنفین کی ۶۳۰۵ کتابیں، فرانسیسی مصنفین کی ۵۲۳۳ کتابیں اور برطانوی مصنفین کی ۳۶۹۲ کتابیں شائع کی گئیں۔

انتہائی کم قیمت کے باوجود سوویت یونین میں کتاب کو ایک بے حد بیش قیمت چیز سمجھا جاتا ہے۔ وہ گھر بہت ہی بد قسمت ہوگا جس کے پاس اپنی نجی لائبریری نہ ہو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ ہر سوویت خاندان سال میں اوسطاً ۲۵، ۳۰ کتابیں خریدتا ہے۔

(مذکورہ کتاب۔ صفحہ ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴)

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

فتنۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

میرے اُن نامکمل سفرناموں کی تعداد جو پاکستان، برما، مشرقِ وسطیٰ، افریقہ، نیپال، یورپ اور برطانیہ وغیرہ کے سفر سے متعلق ہیں اور جن کے بعض حصے مختلف جرائد میں چھپ چکے ہیں خاصی زیادہ ہے لیکن کتابی صورت میں شائع ہونے والا یہ دوسرا سفرنامہ ہے۔ پہلا سفرنامہ "جنوبی ہند میں دو ہفتے" ایک زمانہ ہوا شائع ہوا تھا۔

میری اکثر کتابوں کی طرح میرا یہ سفرنامہ بھی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔ میں برادرِ عزیز شاہد علی خاں جنرل منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے اِس مسودے کو مکتبے کی فہرستِ مطبوعات میں شامل کر کے مجھے یہ موقع دیا کہ میں سفرِ روس کی یہ مختصر روداد اپنے قارئین کے سامنے پیش کر سکوں۔

جگن ناتھ آزاد

شعبۂ اردو،
جموں یونیورسٹی، جموں
۱۵ اگست ۱۹۸۲ء

۱

روس میں پہلا دن

اگر ہم ساڑھے چھ گھنٹے ریل میں سفر کریں تو دہلی سے کان پور تک پہنچیں گے یا دہلی سے جالندھر تک یا جالندھر سے جموں تک اور اگر طیارے میں سفر کریں تو ساڑھے چھ گھنٹے میں دہلی سے ماسکو پہنچ جائیں گے۔ طیارے کے ایک ایسے ہی ساڑھے چھ گھنٹے کے سفر کا مجھے بھی اگلے دن اتفاق ہوا۔ میں ۲۰ ستمبر کو صبح کے آٹھ بجے (ہندستانی وقت کے مطابق) دہلی سے روانہ ہوا اور دن کے بارہ بجے (روسی وقت کے مطابق) ماسکو پہنچ گیا۔ ماسکو کا وقت دہلی کے وقت سے ڈھائی گھنٹے پیچھے ہے اور اس ڈھائی گھنٹے کے فرق کے معنی یہ ہیں کہ جب میں ماسکو پہنچا تو ہندستانی گھڑی کے مطابق ڈھائی بجے بعد دوپہر کا وقت تھا۔

روس اور اس کا دارالحکومت ماسکو میرے لیے ہمیشہ ایک خواب کی طرح رہے تھے۔ روس کے متعلق میں نے جتنا کچھ پڑھا تھا اس سے میرے علم میں تو اضافہ ہوا ہی تھا حیرت میں کہیں زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ نیپولین ایسے جری سپہ سالار کا روس پر حملہ اور روسی نوجوں کے ہاتھوں اس کی عبرتناک شکست۔ ہٹلر کی روس پر چڑھائی اور نیپولین سے بھی زیادہ ذلت آمیز پسپائی، دنیا میں اشتراکی نظامِ حکومت کا پہلی بار تجربہ ــــــ یہ سب میرے اس خواب کے مختلف پہلو تھے جو میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ آخر اس خواب کی تعبیر کا وقت آ گیا اور جب طیارے کے کپتان نے اعلان کیا کہ ہم غزنی سے گزر چکے ہیں اور تھوڑی دیر میں روس کی سرحد میں داخل ہونے والے ہیں تو میں نے اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملا کر کہیں یہ بھی کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن یہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی۔ طیارے کی پلاسٹک سے بند کھڑکی میں سے نیچے جھانکا۔ پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جدنگاہ تک پھیلا ہوا نظر آیا۔ یہ افغانستان کی سرزمین تھی۔ تھوڑی دیر میں پتا چلا کہ ہم روس کی سرزمین پر پرواز کر رہے ہیں۔ اس وقت بھی نظر کے سامنے پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ ویسے ہی پہاڑ تھے، ویسی ہی زمین تھی۔ دونوں علاقوں میں کوئی حدِ فاصل نظر نہ آئی۔ ہاں اقبال کا یہ شعر ضرور یاد آ گیا

جہاں را ز یک آب و گِل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

ٹالسٹائی عالم شباب میں ۱۸۵ء

کوئی آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی رفیقۂ سفر نے نیچے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہم سمندر پر پرواز کر رہے ہیں۔ میں نے نیچے جھانکا تو خشکی سے ملی ہوئی پانی کی ایک طویل و عریض چادر افق تک پھیلتی ہوئی نظر آئی۔ یہ بحیرۂ کیسپین تھا۔ میں نے رفیقۂ سفر کو بتایا کہ ہم اس وقت بحیرۂ کیسپین کے مشرقی ساحل پر پرواز کر رہے ہیں۔ اُس نے بحیرۂ کیسپین کے متعلق اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میرے پاس دنیا کا نقشا تھا میں نے اُسے نقشا دکھایا لیکن اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے مختصر سی بات کی تھی۔ میں نے اسے طول دینے کا بہانہ ڈھونڈنا چاہا تھا۔ نہ چلا۔

تھوڑی ہی دیر میں لق و دق پہاڑوں کی جگہ ہری بھری زمین نظر آنے لگی۔ اشجار، گھاس، سبزہ، ہریالی، پانی، بالکل کشمیر کا سا نظارہ تھا اور میں یہ بھول ہی گیا کہ میں ماسکو جا رہا ہوں۔ کشمیر اور اس کے مناظر کے تصور میں کھو گیا اور جب طیارہ ماسکو کے فضائی مستقر پر اترا تو مجھے اچانک سری نگر کا خیال آیا۔ سری نگر ایک چھوٹا سا فضائی مستقر ہے۔ ماسکو کی طیارہ گاہ اُس کے مقابلے میں بہت بڑی ہے۔ یہاں طیارے تعداد و شمار سے باہر تھے لیکن فضا میں وہی مہک تھی، وہی خوشبو اور ہوا میں وہی لطافت تھی جو سری نگر کے ہوائی مستقر پر اترتے ہی مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے۔ زمین سے اٹھنے والی بھینی بھینی باس بھی وہی تھی اور دور دور تک پھیلی ہوئی ہریالی اور اشجار بھی وہی۔

طیارہ رُک گیا اور میرا یہ تصور بھی منتشر ہو گیا۔ میں اپنا بریف کیس لیے ہوئے نیچے اترا۔ ابھی پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ کی چیکنگ کرا ہی رہا تھا کہ باہر اپنے عزیز دوست ڈاکٹر کمال گاندھی ہاتھ سے اشارہ کرتے نظر آئے۔ انھیں دیکھتے ہی غیر ملک میں پہنچنے کا احساسِ اجنبیت فوراً جاتا رہا اور سفر کی تمام منزلیں آسان ہوتی نظر آئیں۔ باہر نکلا تو ڈاکٹر گاندھی بڑے تپاک سے بغل گیر ہوئے۔ سوویٹ رائٹرز یونین کی طرف سے تانیا نام کی ایک یونیورسٹی ٹیچر ائرپورٹ پر موجود تھیں۔ گاندھی جی نے ان سے تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ ماسکو یونی ورسٹی میں انگریزی پڑھاتی ہیں۔ سوویٹ رائٹرز یونین کے اردو جاننے والے تمام اراکین تالستائی صدی تقاریب میں مصروف تھے۔ تانیا چوں کہ انگریزی جانتی ہیں اس لیے مریم سلگنیک نے مجھے فضائی مستقر سے ہوٹل تک پہنچانے کی ذمہ داری اُن کے سپرد کر دی۔ چنانچہ میں ڈاکٹر گاندھی اور تانیا کی ہمراہی میں ہوٹل کو روانہ ہوا۔ راستے میں گاندھی جی اور تانیا دونوں اہم تاریخی مقامات کے بارے میں بتاتے رہے۔ ہوٹل میں پہنچے تو تانیا نے مجھ سے پاسپورٹ اور ویزا لے کر تمام اندراجات کرا دیے۔ مجھے اس سلسلے میں کوئی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ میں تمام اندراجات مکمل ہو گئے۔ تانیا مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی رخصت ہوئی اور میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں فروکش ہوا۔

یہ ہوٹل جس کا نام رسیا ہوٹل ہے بہت ہی بڑا ہوٹل ہے۔ روس کا سب سے بڑا ہوٹل۔ بعض حضرات نے تو یہ بتایا کہ دنیا کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔ اس میں چھ ہزار سیاحوں کے بیک وقت قیام کا انتظام ہے۔ ماسکو میں بہت ہی مرکزی جگہ پر واقع ہے۔ سوویٹ روس

کا دِل کریملن اس کے بالکل ہی سامنے ہے۔ سڑک کے پار۔ دونوں کے درمیان میں وہ تاریخی چوک ہے جو انقلابات کی تاریخ میں ریڈ اسکوائر (لال چوک) کے نام سے مشہور ہے۔ بالشائے تھیٹر بھی قریب ہے۔ کریملن کے بارے میں میرا خیال یہ تھا کہ اس کے آس پاس پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا ہوگا لیکن ماسکو میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ اندازہ بالکل غلط تھا۔ صرف یہی نہیں کہ کریملن کے سامنے ریڈ اسکوائر میں سڑک پر ہر وقت لوگوں کا ایک ہجوم گزرتا رہتا ہے بلکہ کریملن کے اندر بھی بعض حصّوں میں جانے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ جو بھی چاہے جا سکتا ہے چاہے ملکی ہو یا غیر ملکی۔

ہوٹل میں میرا کمرہ نہایت عمدہ تھا۔ کمرہ نہیں تھا بلکہ سوئیٹ تھا۔ بیڈ روم الگ، ڈرائنگ روم الگ۔ ڈرائنگ روم میں ٹیلی ویژن، ریڈیو، ٹیلی فون، فریجیڈیر سب موجود۔ باتھ روم کو دیکھا ایسا معلوم ہوا جیسے دیواریں ہیرے سے تراش کے بنائی گئی ہیں۔ واش بیسن، ٹب وغیرہ کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ بیڈ روم اور ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں مشرق کی طرف کھلتی تھیں۔ ادھر نظر اٹھائی تو دیکھا نیچے دریائے ماسکو اپنے پورے تجمل اور شکوہ کے ساتھ بہ رہا ہے۔ اس میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اسٹیمر آ جا رہے ہیں۔ یہ نظارہ بہت دلپذیر تھا۔ نہ جانے میں اسے کس وقت تک دیکھتا رہا۔

رات ہوئی تو ماسکو روشنیوں کے شہر میں تبدیل ہو گیا۔ ہوٹل کی چھت پر جا کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ماسکو بقعۂ نور بنا ہوا تھا اور یہ روشنی آہستہ آہستہ ساری دنیا میں پھیل رہی تھی۔

اندر کمار گجرال یہاں ہمارے سفیر کبیر ہیں۔ ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ چار روز کے لیے لندن گئے ہوئے ہیں۔ سفرِ ماسکو کا ایک سبب گجرال صاحب کے ساتھ اشتیاقِ ملاقات بھی تھا بلکہ یہ سفر انھی کی تحریک کا نتیجہ تھا۔ میں بے تابی کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

وہ شام ڈاکٹر گاندھی کے ساتھ بسر ہوئی۔ رات کو انھوں نے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ وہاں پروفیسر اے۔ اے۔ ایکسی نوو سے ملاقات ہوئی۔ آپ ماسکو یونی ورسٹی میں انڈین فائی لالوجی کے شعبے کے صدر ہیں۔ انڈین فائی لالوجی کا یہ شعبہ ماسکو یونی ورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اینڈ افریقین اسٹڈیز کا ایک حصّہ ہے۔ ان سے بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ علم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اردو کی تذکیر و تانیث پر ان کا اندازِ گفتگو انسانی گفتار سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ اردو تذکیر و تانیث کے مسئلے پر پروفیسر ایکسی نوو کے خیالات بڑی حد تک میرے علم میں اضافے کا باعث ہوئے۔ اس موضوع کے علاوہ بھی اردو زبان و ادب کے ساتھ پروفیسر ایکسی نوو کی واقفیت ہر اعتبار سے قابلِ رشک نظر آئی۔ بات چیت میں پریم چند، غالب اور اقبال زیرِ بحث آگئے۔ مجھ سے

انھوں نے فرمائش کی کہ میں ماسکو یونیورسٹی میں اقبال کی شاعری کے کسی پہلو پر تقریر کروں۔ مجھے اس فرمائش سے دلی مسرت ہوئی چنانچہ تین روز بعد، ۷ ستمبر کو شام کے ۵ بجے' میں نے انھی کی زیر صدارت ماسکو یونیورسٹی میں IQBAL'S VISION OF THE NEW MAN کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔

روسی طلبہ کو بعض مصنفین نے اس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے کہ اقبال ایک سوشلسٹ تھے اور بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے دہے میں سوشلزم کا جو تصور تھا وہ ظاہر ہے کہ آج کا تصور نہیں تھا۔ میرے خیالات اس موضوع پر ان مصنفین سے قدرے مختلف ہیں چنانچہ میں نے تصویر کا وہ پہلو جسے میں صحیح سمجھتا ہوں روسی طلبہ اور اساتذہ کے سامنے پیش کیا۔

رات کو کھانا کھا کر جب میں ڈاکٹر گاندھی کے گھر سے واپس آ رہا تھا تو کچھ دیر پیدل چلنے کا اتفاق ہوا۔ کریملن کے پاس سے گزرا تو لوگوں کا ایک ہجوم وہاں دیکھا۔ ریڈ اسکوائر ہی میں اور سڑکوں پر جو ما جاثی کے جو مناظر سولہ برس پہلے برطانیہ اور یورپ میں دیکھے تھے یہاں بھی اکا دکا صورت میں نظر آئے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ امریکہ برطانیہ یا مغربی یورپ کے ہوں لیکن روس کی سرزمین پر یہ نظارے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ حیرت کا اظہار میں اس لیے کر رہا ہوں کہ ۱۹۶۳ء میں فیض احمد فیض نے مجھے لندن میں بتایا تھا کہ روس کی سڑکوں پر ایسکلیٹروں پر اور زمین دوز ریلوں میں ایسے مناظر دیکھنے میں نہیں آتے —— لیکن اس بات کو سولہ برس بھی تو ہو چکے ہیں اور "تہذیب" تو بہت تیز گام ہوتی ہے — پھر بھی یہ مغربی یورپ کی طرح کا نظارہ نہیں تھا۔ اکا دکا واقعے کی بات کر رہا ہوں۔

▲

۲

ماسکو کی ایک جھلک

دوسرے دن (۴ ستمبر کو) میں ہوٹل میں بیٹھا اپنے اعزہ کو خطوط لکھ رہا تھا کہ ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور بولے مجھے آپ کا انٹرپریٹر (INTERPRETER) مقرر کیا گیا ہے۔ میرا نام الیگزینڈر ہے۔ آج سے روس کے سارے سفر میں میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ انٹرپریٹر کے لفظ سے میں یہ سمجھا کہ اردو جانتے ہوں گے چنانچہ اس تصور سے میں بہت خوش ہوا کہ میں اپنے سارے سفر روس میں اردو میں بات چیت کروں گا اور ہندستان واپس جا کر بڑے فخر سے اہل وطن کو بتاؤں گا کہ میں قیام روس کے دوران میں اردو ہی میں بات چیت کرتا رہا ہوں لیکن میری یہ مسرت دیرپا ثابت نہ ہوئی کیونکہ جلد ہی پتا چلا کہ الیگزینڈر انگریزی جانتے ہیں اردو نہیں جانتے۔ گویا ایک ہندستانی اور وہ بھی اردو والے ہندستانی اور اہل روس کے درمیان رابطے کی زبان انگریزی نکلی۔

الیگزینڈر ایک اچھے پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ ان سے مل کے مجھے خوشی ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں روس میں کیا کیا دیکھنا چاہوں گا اور کن کن لوگوں سے ملنا چاہوں گا۔ میں نے وجہ سفر بیان کی اور اپنے مجوزہ پروگرام کا ایک خاکہ ان کے سامنے رکھا۔ انھوں نے تمام باتوں کو بڑی احتیاط سے ایک کاغذ پر لکھ لیا اور بولے کہ میں آپ کی تجاویز سوویٹ رائٹرز یونین کی صدر کے سامنے رکھوں گا اور ان کی اجازت کے بعد ان پر عمل شروع ہو گا۔ سر دست میں آپ کو ماسکو کی سیر کرانے لے چلتا ہوں چنانچہ مجھے وہ گاڑی میں بٹھا کے ہوٹل سے باہر لائے اور ریڈ اسکوائر، کریملن، لینن ایوی نیو، بیلورُوسکی ریلوے اسٹیشن، گگارین اسکوائر، لینن سنٹرل اسٹیڈیم، پشکن اسکوائر، لینن اسٹیٹ لائبریری، اگو سو مولسکایا اسکوائر، لانسکی وروشا اسکوائر، یونی ورسٹی ایوی نیو، لینن ہلز، ماسکو اسٹیٹ یونی ورسٹی، کٹوزوو ایوی نیو، جنگ بورو ڈینو کا پس منظر (جہاں نپولین کو شکست فاش ہوئی تھی)، محراب فتح، ڈزرزنسکی اسکوائر، گورکی اسٹریٹ اور بالشائے تھیئٹر کی سیر کراتے ہوئے سوویٹ رائٹرز یونین کے دفتر میں لے آئے۔ لان میں داخل ہوتے ہی تالستائی کے ایک عظیم مجسمے پر نظر پڑی۔ ایسا نظر آتا تھا جیسے یہ عمارت زار شاہی زمانے میں کسی کاؤنٹ کا محل رہا ہو۔ یہاں یونین کی صدر مریم سلگنیک سے ملاقات ہوئی۔ کوئی بیس

سال قبل مریم سلگینک کے ساتھ میری خط وکتابت رہی تھی۔ اردو میں ابتداً ان کے ایک عنایت نامے سے ہوئی تھی جو اردو میں تھا۔ انھیں وہ زمانہ یاد تھا۔ انھیں غالب صدی تقاریب کے وقت کی مختصر سی ملاقات بھی یاد تھی۔ مریم سلگینک کی بات چیت میں حسب توقع ایک تپاک تھا۔ مل کے جی خوش ہوا۔ میری تجاویز الیگزینڈر نے ان کے سامنے رکھیں۔ سلگینک نے ان پر صاد کیا اور بیٹویا کے سفر کا فہرست میں اضافہ کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ماسکو یونیورسٹی میں آپ اپنا مقالہ پڑھ رہے ہیں تو ایک مقالہ لینن گراڈ یونیورسٹی میں بھی پڑھیے۔ ماسکو ریڈیو سے تقریر کی دعوت بھی انھوں نے دی۔ ہاں یاد آیا دن میں ماسکو ریڈیو سے شاہدہ زیدی کا ٹیلی فون مل چکا تھا۔ ان کا نام اور ٹیلی فون نمبر مجھے سردار جعفری نے دیا تھا۔ ویسے ان سے ملاقات ان کی بہنوں ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی کے ساتھ سرسری طور پر کہیں بھی ہو چکی تھی۔ یہ پریس انفارمیشن بیورو ہی میں ایک روز ان کے ساتھ خاصی طویل ملاقات ہوئی تھی۔ ماسکو پہنچ کے میں نے شاہدہ کو دو ایک بار ٹیلی فون کیا تھا۔ نہ ملیں۔ انھیں میرا پیغام ملا تو انھوں نے ٹیلی فون کیا اور ساتھ ہی ریڈیو سے بات چیت کی فرمایش بھی کی چنانچہ جب سلگینک نے ریڈیو سے بات چیت کے متعلق کہا تو میں نے انھیں بتایا کہ شاہدہ اس سلسلے میں مجھ سے پہلے ہی کہہ چکی ہیں۔ سلگینک نے کہا کہ آپ پہلے روس کے قابل دید مقامات بھی دیکھ لیں اور جن جن لوگوں سے ملنا ہے ان سے مل بھی لیں۔ اس کے بعد اپنے تاثرات ماسکو ریڈیو پر بیان کریں۔ ساتھ ہی انھوں نے NPA کے لیے ایک مقالہ لکھنے کی فرمایش بھی کی۔ یہ تمام فرمایشیں ہر اعتبار سے حوصلہ افزا تھیں۔ سلگینک کے ساتھ ساری بات چیت انگریزی میں ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے انھوں نے مجھ سے "اجازت" لے کر الیگزینڈر اور این پی اے کے ساتھ روسی میں بات چیت کی۔ بعد میں جب مجھ سے انھوں نے دوبارہ انگریزی میں بات شروع کی تو میں نے کہا کہ جس طرح الیگزینڈر کے ساتھ آپ کی بات چیت کا ذریعہ روسی زبان ہے اسی طرح میرے ساتھ آپ کی بات چیت کا ذریعہ اردو ہے۔ انگریزی نہ میری زبان ہے نہ آپ کی تو ہم کیوں اس زبان میں بات کریں۔ سلگینک نے ہنستے ہوئے میری بات کی تائید کی چنانچہ بعد میں ان کے ساتھ جو بات چیت ہوئی اردو میں ہوئی۔

میں نے ان سے پوچھا اردو آپ نے کہاں پڑھی ہے؟ بولیں ماسکو میں۔ اسی لیے میرا لہجہ روسی ہے۔ میں نے کہا لہجے کی بات یہ ہے کہ ہندستان یا پاکستان میں یہ توقع کرنا کہ وہاں دو شہروں کا لہجہ ایک سا ہو گا لسانی اعتبار سے مناسب نہیں ہے۔ لہجہ تو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بدل جاتا ہے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے راولپنڈی اور لاہور کے لہجے میں فرق ہے لکھنؤ اور پٹنے کے لہجے میں فرق ہے۔ دہلی اور حیدرآباد کے لہجے میں فرق ہے۔ لکھنؤ کا نام آیا تو کہنے لگیں مجھے دہلی کے مقابلے میں لکھنؤ کا لہجہ پسند ہے۔ صاف، ستھرا، شیریں۔ دہلی کے متعلق بولیں کہ یہاں پنجابی بڑی بھاری تعداد میں آ گئے ہیں اور پنجابی نے اردو کے حسن کو ختم کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہی پنجابی اردو کے اس نازک دور میں اردو کے حامی بھی ہیں۔ انھوں نے مجھ

سے اتفاق کیا۔

اٹھنے لگا تو یاد آیا سردار جعفری نے ان کے لیے مجھے ایک خط دیا تھا۔ وہ خط میرے پاس تھا۔ معذرت کے ساتھ خط ان کے حوالے کیا کہ شروع میں خیال نہ رہا۔

یہاں سے اجازت لے کے ہم لوگ ہندستانی سفارت خانے آئے۔ ڈاکٹر گاندھی اور دوسرے احباب سے ملے۔ وہاں سے ہوٹل واپس پہنچے۔ کھانا کھایا۔ کمرے میں آئے تو الیگزینڈر نے ٹیلی وژن چلایا اور مجھے تصویروں کے ساتھ نفس مضمون سے آگاہ کرتے چلے گئے۔

دن بھر موسم بہت عمدہ رہا تھا۔ دھوپ چمکتی رہی اور دھوپ میں ماسکو موتی کی طرح دمکتا دکھائی دیتا رہا لیکن شام کو ہلکی سی بارش ہو گئی اور خنکی بڑھ گئی۔ موسم یہاں کا بالکل کشمیر کی طرح ہے۔ ذرا بادل آ جائیں تو خنکی شدید ہو جاتی ہے اور بادل ہٹ جائیں، دھوپ نکل آئے تو موسم بہت خوش گوار ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت پہلے دن کی سیاحت میں رہی۔ ہوٹل سے نکل کے جب ہم لوگ، میں، الیگزینڈر اور ڈرائیور، لینن ایوی نیو پہ پہنچے تو دھوپ چمک رہی تھی لینن ایوی نیو خاصی بلندی پر ہے۔ وہاں سے ماسکو کا ایک حصہ یوں نظر آتا ہے جیسے ہم اسے کسی ہوائی جہاز سے دیکھ رہے ہوں۔ دور و نزدیک بلند و بالا عمارتیں نظروں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ نیچے دریائے ماسکو صدیوں کی تاریخ کو سمیٹے چپ چاپ پورے جاہ و جلال کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اس کے کنارے کسی کالج کے طالب علم اپنی یونی فارم میں ملبوس فزیکل ٹریننگ میں مصروف تھے۔ یہ نظارہ آنکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوا۔

▲

(۳)

لینن میوزیم میں چند لمحے

تیسرے دن (۵ ستمبر کی) صبح کو جاگا اور کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو سڑکیں پانی سے تربتر تھیں۔ غالباً رات کو ابھی بارش ہوئی تھی لیکن کمرے چوں کہ ایر کنڈیشنڈ ہیں اس لیے باہر بارش ہو رہی ہو تو امدرنہ ان کی آواز آتی ہے نہ اس کا ٹمپریچر پر اثر پڑتا ہے۔ سڑک پر ٹریفک کا شور و شغب بھی کمرے تک نہیں پہنچتا بلکہ سچ پوچھیں تو ماسکو میں سڑک پر ٹریفک کا شور و شغب ہوتا ہی نہیں۔ موٹر کاریں اور بسیں وغیرہ ذوالفقار علی خاں کے موٹر کی طرح تیز پا ہونے کے ساتھ ہی ساتھ خوش بھی ہیں اس اعتبار سے ماسکو کو ایک سناٹے کا شہر کہیں تو غلط نہ ہو گا گو کہ اسٹریٹ پر ٹریفک بہت زیادہ ہوتا ہے لیکن کیا مجال جو کسی طرح کا شور کانوں میں پڑ جائے ہاں ہوائی جہاز اوپر سے گزر جائے تو بات دوسری ہے۔

میں الیگزینڈر کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ۱۱ بجے انھیں آنا تھا۔ اسی دوران میں ڈاکٹر گاندھی کا فون آیا اور انھوں نے بتایا کہ پروفیسر اوما شنکر جوشی آج ۹ بجے کے طیارے سے آرہے ہیں۔ جوشی جی گجراتی کے ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے شاعر ہیں۔ ہماری ساہتیہ اکیڈمی کے صدر ہیں۔ دہلی میں بین الاقوامی اقبال صدی تقاریب کا افتتاح انھی نے کیا تھا۔ اس موقعے پر انھوں نے اقبال پر جو مقالہ پڑھا وہ ایک دائمی ادبی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی شخصیت پر اقبال کے اس مصرعے کا بآسانی اطلاق ہوتا ہے۔ ؏ بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق۔

تھوڑی دیر میں گاندھی جی جوشی صاحب کو اپنے ساتھ لے کے اسی ہوٹل میں پہنچ گئے جہاں میں مقیم تھا۔ گاندھی جی نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر نامور سنگھ، ڈاکٹر قمر رئیس اور پروفیسر گوپی چند نارنگ بھی اسی طیارے سے ماسکو پہنچے ہیں اور رمنسک ہوٹل میں مقیم ہیں۔ یہ تینوں حضرات فرینڈشپ ہاؤس کے مہمان تھے۔ جوشی صاحب میری طرح سوویٹ رائٹرز یونین کے مہمان تھے۔ اس وقت تک الیگزینڈر بھی پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کے چائے پی۔ یہ مہربانی ڈاکٹر گاندھی کی طرف سے تھی۔ جوشی صاحب نے کہا کہ آزاد صاحب! آپ سے ملنے کے لیے روس آنا پڑا۔ میں نے کہا میں اگر دہلی میں ہوتا تو میری طرف سے یہ گستاخی ہرگز نہ ہوتی۔ کتنی بار آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکا ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ میں جموں میں ہوں اور دہلی کی

ادبی سرگرمیوں سے دور ہو گیا ہوں۔

چائے کے بعد میں اور الیگزینڈر لینن کا مقبرہ دیکھنے کے لیے نکلے۔ وہاں پہنچے تو ایک بہت طویل کیو (Q) سے سابقہ پڑا۔ کیو میں ہم لوگ کھڑے ہوئے تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اب میرے لیے بارش میں کھڑا ہونا دشوار تھا۔ بقول فراق ؏

اے وہ درد محبت سہی تو کیا مر جائیں

فوراً ہوٹل کا رخ کیا۔ کمرے پر پہنچے۔ تھوڑی دیر بات چیت کی۔ اسی دوران میں حبیب الرحمن صاحب اور اشفاق صاحب کے ٹیلی فون آئے۔ انھوں نے دن کے پروگرام کے متعلق پوچھا۔ میں نے تفصیل کہہ سنائی۔ اشفاق صاحب نے شام خالی رکھنے کی فرمائش کی۔

کھانے کے بعد موسم قدرے بہتر تھا۔ سوچا اب پھر لینن کے مقبرے کا رخ کرنا چاہیے۔ وہاں پہنچے تو ملشیا والوں نے بتایا کہ مقبرہ ایک بجے بند ہو جاتا ہے لیکن ابھی دو چار منٹ میں، ٹھیک تین بجے، CHANGING OF THE GUARD ہو رہا ہے وہ دیکھ کے جائیے۔

یہ منظر میں لندن میں (شاید بکنگھم پیلس پر) کئی CHANGING OF THE GUARD برس پہلے دیکھ چکا تھا۔ بالکل ویسا ہی منظر تھا۔ انتہائی دل کش۔ دونوں مناظر ڈسپلن اور ٹریننگ کی ایک ایسی تصویر تھے جس کی تعریف الفاظ میں ممکن نہیں۔

اس کے بعد لینن میوزیم کے بارے میں پوچھا۔ پتا چلا کہ ابھی کھلا ہے۔ پانچ بجے تک کھلا رہے گا۔ چنانچہ ہم نے لینن میوزیم کا رخ کیا۔ اندر داخل ہوتے ہی عظیم لینن کے ایک عظیم مجسمے نے ہمارا استقبال کیا اور جوں جوں میں میوزیم میں آگے بڑھتا گیا مجھ پر ہیبت کی ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی گئی جو لینن کے متعلق متعدد کتابیں پڑھنے پر بھی طاری نہ ہوئی تھی۔ یہ میوزیم کیا تھا تاریخ کا ایک بڑا اہم باب تھا جس کے صفحے لمحہ بہ لمحہ میرے سامنے کھلتے جا رہے تھے اور یقین محکم عمل پیہم کا مفہوم مجھ پر واضح کرتے چلے جا رہے تھے۔ نہ جانے یہ شخص فولاد کا بنا ہوا تھا، یا کیا تھا۔ اس کو کیا طلسماتی قوت عطا ہوئی تھی کہ اس نے غلاموں کے اندر بغاوت کا جذبہ بیدار کر کے زار شاہی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

مختلف کمروں میں لینن کے کوٹ، اوور کوٹ، ٹوپیاں اور دوسرے کپڑے رکھے تھے۔ وہ تحائف بھی تھے جو اسے عوام نے پیش کیے تھے۔ اس کے زیر استعمال آنے والی میزیں بھی، کرسیاں بھی۔ لیکن ایک کمرہ ایسا تھا جسے میں دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ یہ لینن کے مطالعے کا کمرہ تھا اور بالکل اسی انداز پر سجایا گیا تھا جس انداز سے یہ لینن کے زیر استعمال رہا تھا۔ میز پہ دائیں طرف بجلی کا لیمپ جل رہا تھا۔ سامنے پیپر کٹر اور قینچی رکھی تھی۔ قلم دوات کاغذ بالکل اسی طرح رکھے تھے جس طرح وہ لینن کے استعمال میں رہتے تھے۔ کرسی کے پیچھے اور دائیں بائیں کتابوں سے بھرے ہوئے ریک اور الماریاں رکھی تھیں۔ اس کمرے نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میری نظر میں چارلس ڈکنز، شیکسپیئر اور اقبال کے وہ کمرے گھوم گئے جن میں یہ لوگ رہتے تھے اور جس میں انھوں نے فلک بوس بلندیوں والا ادب پیدا کیا تھا۔ لینن کے تخلیقی

ادب کی نوعیت دوسری تھی لیکن روس کی عظمت بتا رہی ہے کہ رتبے میں کسی سے کم نہیں تھی۔

لینن میوزیم سے باہر نکلے تو پھر بارش نے گھیر لیا۔ گاڑی آج ہمارے پاس نہیں تھی لیکن فوراً ہی ٹرالی بس مل گئی جس نے بڑے آرام سے ہوٹل تک پہنچا دیا۔

ہوٹل واپس آ کے پتا چلا کہ ماسکو یونی ورسٹی میں لیکچر کی تاریخ طے ہو چکی ہے اور وقت بھی۔ ۷ ستمبر شام کے ۵ بجے۔ دوسری اطلاع یہ تھی کہ دوسرے دن مجھے اور جوشی صاحب کو روسی ادیبوں اور دنیا کے تیس ملکوں سے آئے ہوئے ڈیلیگیٹوں کے ساتھ یاسنا پولیانا جانا ہے جو تالستائی کی جنم بھومی ہے۔ ان دنوں روس میں تالستائی کی ایک سو پچاسویں سال گرہ منائی جا رہی ہے اور یاسنا پولیانا میں ہم لوگوں کو اس عظیم فن کار کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنا ہے۔ اس اطلاع سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ابھی گزشتہ دسمبر میں مجھے لاہور اور سیالکوٹ (پاکستان) جانے کا شرف حاصل ہوا تھا جہاں علامہ اقبال کے گھر جا کر ان کی یاد میں میں نے اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کیا۔ آج مجھے تالستائی کی جنم بھومی میں پہنچ کے یہی فرض ادا کرنے کی سعادت مل رہی تھی —

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
(حسرت موہانی)

اس وقت اقبال کے یہ اشعار جو انھوں نے عالمِ بالا کی صحبتِ زندگاں میں تالستائی کے منہ سے کہلوائے ہیں میرے حافظے میں تازہ ہو گئے۔

بارکشِ اہرمن لشکریِ شہریار — از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
زشت بہ خویش نکوست مغز ندانند ز پوست — مردکِ بیگانہ دوست سینۂ خویشاں درید
دارو ئے بیہوشی است تاجِ کلیسا وطن — جانِ خدا داد را خواجہ بہ جامے خرید

اور

عقلِ دورو آفرید فلسفۂ خود پرست
درسِ رضا می دہد بندۂ مزدور را

اور میں سوچنے لگا کہ وہ وقت کب آئے گا جب دنیا ادیبوں اور شاعروں کے تصور کی دنیا بنے گی — ایک اکائی — جس میں انسان صرف دنیا کا شہری ہو گا۔

میں نے اسی وقت قمر رئیس کو فون کرنا چاہا کہ ان سے پوچھوں وہ اور ڈاکٹر نامور سنگھ بھی کل کی یاترا میں شریک ہیں یا نہیں۔ کوشش کے باوجود ڈاکٹر قمر رئیس نہ مل سکے۔ ڈاکٹر نامور سنگھ مل گئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دونوں یاسنا پولیانا جا رہے ہیں۔ یہ اطلاع باعثِ مسرت ہوئی۔

شام ہوتے ہی مرزا اشفاق بیگ حسب وعدہ تشریف لائے۔ کھانے پینے کا سامان وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ دس بجے تک ان کے ساتھ محفل جمی رہی۔ بنے بھائی، نفیس، سبط حسن، خواجہ احمد عباس اور سردار جعفری کی باتیں ہوتی رہیں۔ شعر و شاعری کا دور بھی چلا۔ گویا ماسکو میں تھوڑی دیر کے لیے ہم دونوں نے ایک چھوٹا سا برصغیر ہند و پاک بنا لیا۔

اشفاق صاحب پروگریس پبلشرز سے وابستہ ہیں اور براہِ راست روسی سے اردو میں کتابوں کا ترجمہ کرتے ہیں۔ یہ ادارہ ماسکو میں علم کی ایک ایسی جوت جگائے ہوئے ہے جس کی تجلی مشرق و مغرب میں دور دور تک پہنچ رہی ہے۔

رات کو میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ قمر رئیس کا ٹیلی فون آیا۔ ماسکو میں ان کی آواز سن کے جی خوش ہو گیا۔ بولے کل یاسنا پالیانا کے لیے گاڑیاں آپ کے ہوٹل سے چلیں گی۔ ہم لوگ صبح سات بجے آپ ہی کے ہوٹل میں آ جائیں گے۔ پھر دن بھر ساتھ رہے گا۔ اس سے زیادہ خوش آیند اطلاع اور کیا ہو سکتی تھی۔

▲

(۴)

تالستائی کے گھر میں

اگلی صبح میں بہت جلد جاگ گیا۔ ساڑھے چار بجے۔ اس کا سبب دراصل میری کاہلی تھی نہ کہ چستی۔ میں صبح تیاری میں بہت وقت صرف کرتا ہوں۔ چوں کہ سات بجے تک تیار ہونا ضروری تھا۔ اس لیے اپنے آپ پر جبر کر کے میں ساڑھے چار بجے ہی اٹھ بیٹھا۔ ساڑھے ۶ بجے ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر نامور سنگھ اور ملیالم کے شاعر گروپ آ گئے۔ گرپ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ قمر رئیس اور نامور سنگھ کے ساتھ ماسکو میں خلافِ توقع ملاقات سے جو مسرت ہوئی لفظوں میں نہیں آ سکتی۔

آٹھ بجے بسیں یاسنا پالیانا کو روانہ ہوئیں۔ یاسنا پالیانا جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں تالستائی کی جنم بھومی ہے۔ ماسکو سے دو سو سالٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہم لوگ رستے میں تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد بارہ بجے دن میں وہاں پہنچے۔ ہماری گاڑیوں کے آگے ملشیا کی ایک کار چل رہی تھی جس میں ملشیا کا ایک افسر تھا۔ اس لیے منزلِ مقصود تک سڑک صاف ملتی چلی گئی اور گاڑیوں کی رفتار اچھی رہی۔

جب تک گاڑیاں ماسکو کی حدود میں رہیں سڑک کے دونوں طرف فیکٹری ورکروں کے بیس بیس پچیس پچیس منزلہ[1] مکانات نظر آتے رہتے۔ ماسکو سے باہر نکلے تو دل نواز کھیت اور اشجار نظروں کے لیے دل کشی کا سامان بن گئے۔ لوگوں کے چہروں پر ایک بشاشت اور طمانیت نظر آئی اور ہر فرد کو اپنے اپنے کام میں مصروف پایا۔ یہ بشاشت اور طمانیت روزِ اول سے اہلِ روس کے چہروں پر مجھے نظر آ رہی تھی اور میں حیران ہو رہا تھا کہ بعض رجعت پسند کس طرح اہلِ روس کی زندگی کے بارے میں غلط قسم کا پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔ ہندستان میں اکثر رجعت پسندوں کو میں نے

---

[1] ان مکانوں کے بارے میں پتا چلا کہ ان مکانوں کی الاٹمنٹ دنیوی مرتبے کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ کنبے کے افراد کی تعداد کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر ایک مزدور کے چار بچے ہیں بیوی ہے تو اسے تین کمروں کا مکان ملے گا اس کے افسر یا ڈائرکٹر کا کنبہ اگر دو افراد پر مشتمل ہے تو اسے ایک کمرے کا مکان ملے گا۔

یہ کہتے سنا ہے کہ روس میں فرد کی آزادی مفقود ہے۔ بات چیت پر پابندی ہے لیکن یہاں آکے دیکھا کہ اخبارات میں ہر روز متعدد خطوط ایسے چھپتے ہیں جن میں حکومت کے کاموں پر تنقید ہوتی ہے یا شکایتیں ہوتی ہیں اور حکومت ان شکایتوں کو نظر انداز نہیں کرتی۔

یاسنا پالیانا جاتے ہوئے ایک عجیب و غریب واقعہ دیکھا۔ ہمارے آگے جو ملشیا کی گاڑی چل رہی تھی وہ ایک ریلوے کراسنگ کے قریب پہنچ کے رک گئی کیوں کہ ریلوے کا پھاٹک بند تھا اور ریل آنے والی تھی۔ ملشیا کے ڈرائیور نے غلطی سے اپنی گاڑی سڑک کے بائیں طرف پارک کر دی (روس میں ٹریفک دائیں ہاتھ چلتا ہے) ریلوے پھاٹک کی انچارج ایک عورت تھی جیسے ہمارے یہاں لائن مین ہوتے ہیں۔ اس نے ملشیا افسر کو اس غلطی پر ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ملشیا افسر نے گاڑی سے باہر آکر ڈرائیور کی غلطی کے لیے اس لائن وومن سے معافی مانگی۔ میں اس بات کا کبھی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ملشیا افسر یا پولیس افسر کو کوئی لائن وومن ڈانٹ سکتی ہے اور ملشیا افسر یا پولیس افسر لائن وومن سے معافی مانگ سکتا ہے۔ نہ جانے قانون کے احترام کی اس اونچی منزل تک پہنچنے کے لیے بعض اور ممالک کو کتنی دیر لگے۔

وہ جسے وقارِ محنت (DIGNITY OF LABOUR) کہتے ہیں مجھے یہاں جگہ جگہ نظر آیا۔ محنت کرنے والے مزدور کو یہاں حقارت سے کوئی نہیں دیکھتا اور وہ بھی اپنے آپ کو کسی سے کم نہیں سمجھتا۔

کام کے ساتھ لگن اہل روس کے مزاج کا ایک خاصہ ہے۔ اگر کوئی شخص ڈیوٹی پر ہے تو وہ آپ کے ساتھ آدھا منٹ بھی بیکار بات نہیں کرے گا۔ کوئی لڑکی بے شک آپ پر جان دیتی ہو لیکن اس کی ڈیوٹی کے اوقات میں آپ اس بات کی توقع نہ رکھیں کہ وہ آپ کی طرف مسکرا کے دیکھے گی یا آپ کے ساتھ بات کرے گی۔

یاسنا پالیانا کے راستے میں اناج اور ترکاریوں کے بڑے بڑے کھیت حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کوئی ایسی حد بندی نظر نہ آئی جس کی بدولت ایک کھیت بنواری لال کا بن جاتا ہے اور دوسرا غلام رسول کا۔ یہ کھیت عوام کی مشترکہ ملکیت تھے اور ان کی آمدنی عوام ہی کے لیے تھی۔ روسی اشتراکی نظام کا یہ پہلو حیرت انگیز حد تک حسین اور دلکش ہے۔ تمام کھیت یا حکومت کی ملکیت ہیں یا کوآپریٹو سوسائٹی کی۔ یعنی دونوں صورتوں میں پرائیویٹ ملکیت کی لعنت سے آزاد ہیں۔

قمر رئیس اور میں بس میں ساتھ ہی ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ میرے لیے گائیڈ کا فریضہ ادا کر رہے تھے کہ روس کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ ماسکو سے باہر نکلتے ہی تولانامی ایک مقام آیا۔ اس کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ہٹلر کی فوجوں کو روسی فوج نے اس مقام سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ روسی فوج یہاں نازیوں کے لیے سدِ سکندری بن گئی۔

یاسنا پالیانا پہنچتے ہی ہم لوگ سیدھے تالستائی کے مکان پر گئے جو اب تالستائی میوزیم کہلاتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا مکان ہے اور تالستائی کے زیرِ استعمال آنے والے سامان سے بھرا

پڑا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تالستائی کا ایک اور مکان ہے جو تالستائی ادبی میوزیم کہلاتا ہے۔ اس میں تالستائی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے، خطوط اور اس کے ذاتی کتب خانے کی کتابیں رکھی ہیں۔ مہاتما گاندھی کے متعلق کتابیں اس کتب خانے میں خاصی تعداد میں نظر آئیں۔

ان دونوں عجائب گھروں کو تفصیل سے دیکھنے کے بعد دنیا بھر سے آئے ہوئے ادیبوں اور فن کاروں کا یہ قافلہ تالستائی کی قبر کی جانب روانہ ہوا جو ان عجائب گھروں سے کوئی نصف میل کے فاصلے پر اشجار سے گھری ہوئی ایک ہری بھری فضا میں ہے۔ یہ مٹی کی قبر ہے، سیدھی سادی۔ نہ اس پر کوئی مقبرہ ہے نہ کوئی سنگِ مزار بس "سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے" والا معاملہ ہے۔ تالستائی نے اپنی قبر کے متعلق دو وصیتیں کی تھیں۔ ایک یہ کہ میری قبر وہاں بنائی جائے جہاں قریب سے لوگ گزرتے رہیں دوسرا یہ کہ میری قبر پر کبھی پھول نہ چڑھائے جائیں چنانچہ تالستائی کی قبر پر آج تک کبھی پھول نہیں چڑھائے گئے لیکن اب کے سوویٹ رائٹرز یونین نے ایک ریزولیوشن کے ذریعے وصیت کے اس حصے پر عمل نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اکثر ادیبوں اور شاعروں نے اس قبر پر پھول چڑھائے۔ سوویٹ رائٹرز یونین کے فرسٹ سکریٹری گیورگی مارکو نے جو روس کے ایک نامور شاعر ہیں ایک ہار قبر پر رکھا اور بڑے احترام کے ساتھ جھک کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس سے ہم سب لوگ بہت متاثر ہوئے۔ اپنے بڑے فن کاروں کا احترام کرنا کسی ملک اور قوم کی اپنی عظمت کی دلیل ہے۔ اس تقریب میں روسی صحافیوں کی فرمائش پر پروفیسر اوماشنکر جوشی نے اپنے تاثرات بیان کیے اور ان کے یہ تاثرات روس کے متعدد اخبارات میں شائع ہوئے۔

اس تقریب کے بعد ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور ۴ بجے روانہ ہو گئے شام کے سات بجے تک واپس ماسکو پہنچ گئے۔

قمر رئیس میں تو ابھی بہت دم خم تھا۔ کہنے لگے میں حبیب الرحمٰن صاحب سے ملنے جاؤں گا۔ میں تھک گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے پروفیسر اوماشنکر کے ساتھ ان کے کمرے میں گیا۔ وہ دہلی میں میری اقبال نمائش دو بار دیکھ چکے تھے اور اس سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے نمائش کا ذکر چھیڑا اور بات اقبال کی شاعری تک جا پہنچی ـــ گویا "بات پہنچی تری جوانی تک" وہاں سے میں اپنے کمرے میں آیا اور ذرا سا کھانا کھا کے سو گیا۔

▲

۵

ماسکو یونی ورسٹی میں

ساتویں کی صبح کو جاگا تو ڈاکٹر گاندھی کو ٹیلی فون کیا۔ پتا چلا گجرال صاحب لندن سے واپس آگئے ہیں۔ پون بجے ان کے ساتھ ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ الیگزینڈر نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ یونی ورسٹی میں تقریر پانچ بجے نہیں بلکہ چار بجے ہوگی۔ تھوڑی دیر میں وہ خود آ گئے۔ خیال یہ تھا کہ آج لینن کا مقبرہ دیکھیں گے لیکن چونکہ گجرال صاحب کے ساتھ وقت ملاقات طے ہوگیا تھا اس لیے ہم نے ہندستانی سفارت خانے کا رخ کیا۔ گجرال صاحب اسی تپاک سے ملے جس تپاک سے ہندستان میں ملتے رہے ہیں۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ میرے پروگرام کے بارے میں پوچھتے رہے۔ پھر گاندھی جی کو بلا کر ان سے کہا کہ آزاد کے پروگرام میں سمرقند اور بخارا کا سفر شامل کرا دیجیے۔ تاشقند کا اضافہ کرنے کے لیے ڈاکٹر گاندھی خود ایک دن قبل مریم سالگینک سے کہہ چکے تھے۔ گویا پروگرام بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ۲۳ تک ریگا، لینن گراڈ، کریمیا اور دوشنبہ کا سفر کر کے ماسکو واپس پہنچنا تھا۔ اب اس میں تاشقند، سمرقند اور بخارا کا اضافہ ہو رہا تھا اور ۲۳ ہی کو پروگرام کے مطابق مجھے دہلی روانہ ہونا تھا لیکن پتا چلا کہ ۲۳ اور ۲۴ کو ہندستان کے لیے کوئی فلائٹ نہیں ہے۔ ۲۵ رکھیے۔ ڈاکٹر گاندھی نے ایئر انڈیا کے منیجر کو ٹیلی فون کیا۔ جواب ملا طیارے کی ہر سیٹ بک ہو چکی ہے۔ اس اطلاع سے میرے تو ہوش اڑ گئے لیکن ڈاکٹر گاندھی نے کہا آپ گھبرائیے نہیں ہم لندن تار دے کر آپ کے لیے ایک نشست ریلیز کرا دیں گے۔

ڈاکٹر گاندھی کی روس میں موجودگی میرے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔

مطلع اس روز پھر ابر آلود تھا۔ دراصل روس میں سردیاں شروع ہو چکی تھیں اور کپڑے میں بہت کم لے کے گیا تھا۔ بات یہ تھی کہ سامان ۲۰ کلو تک ساتھ لے جانے کی اجازت تھی۔ میں نے اپنی کتابیں زیادہ تعداد میں اپنے ساتھ رکھ لیں۔ پندرہ سولہ کلو تو انھیں کا وزن ہوگیا، باقی چار پانچ کلو کپڑوں کی گنجائش رہی۔ اب چار پانچ کلو میں کیا کپڑے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ قریب قریب ٹھٹھرتا ہی رہا۔ اگر اہلِ روس کا تپاک اور ان کے خلوص کی حرارت جو ہندستان کے لیے اُن کے دلوں میں ہے میری حفاظت نہ کرتی تو اس سردی میں وہاں رہنا دشوار ہو جاتا۔

تالستائی یاسنا پالیانا میں اپنے مکان کی چھت پر ۱۹۰۸ء

لینن کے مقبرے کی زیارت اس روز بھی رہ گئی تھی۔ وہی اقبال والا معاملہ بن رہا تھا۔ وہاں تو خیر یہ بات تھی کہ

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب

یہاں صرف اتنا فرق تھا کہ لینن کو دیکھنے کا حوصلہ مجھ میں تھا (اقبال سے ملاقات کا تو حوصلہ ہی نہ ہوتا تھا) لیکن

وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

والی کیفیت یہاں بھی موجود تھی۔

شام کو ایک گھنٹہ خالی مل رہا تھا۔ سوچا اس وقفے میں کریملن کی سیر کی جائے۔ وہاں پہنچے۔ پتا چلا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب یہ ایک گھنٹہ ضائع کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کریملن کے باہر ہی الیگزینڈر پارک کی سیر کی۔ وہاں کریملن کی دیوار کے سائے میں ہماری جواہر جیوتی کی طرح نامعلوم سپاہی کی قبر پر آگ روشن تھی — ہمیشہ جلتے رہنے والی آگ۔ وہاں خیال آیا کہ زمین دوز ریل کا اسٹیشن قریب ہے۔ آدھ گھنٹہ زمین دوز ریل میں سفر کیا جائے۔ فیض صاحب نے لندن میں مجھ سے کہا تھا کہ کبھی ماسکو جاؤ تو زمین دوز ریل اور اس کے اسٹیشن ضرور دیکھنا۔ یہ پیرس اور لندن کے اسٹیشنوں سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ یہ اسٹیشن تو ایسے ہیں جیسے محل تعمیر کیے گئے ہوں۔ ریلیں بھی کہیں زیادہ آرام دہ ہیں۔

زمین دوز ریل کا سفر کوئی آدھے گھنٹے تک رہا۔ اس سے فارغ ہو کے باہر زمین پر آئے، گاڑی میں بیٹھے اور ماسکو یونی ورسٹی کا رخ کیا جہاں تقریر کرنے کی دعوت پروفیسر الیکسی اونوف کی طرف سے تین دن قبل مل چکی تھی۔ الیگزینڈر کے ہمراہ میں یونی ورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اینڈ افریقن اسٹڈیز میں پہنچا۔ پروفیسر الیکسی اونوف یہاں انڈین فائی لالوجی کے صدرِ شعبہ ہیں۔ انھوں نے ہندی ڈیپارٹمنٹ کی ریڈر ڈاکٹر پوپووانینا سے ملایا۔ انھوں نے ہندی میں بات چیت شروع کی۔ پروفیسر سازانووا بھی ہندی کی استاد ہیں۔ انھوں نے بھی ہندی میں گفتگو کی۔ ان کی دیکھا دیکھی پروفیسر الیکسی اونوف نے بھی انگریزی چھوڑ کے اردو میں بولنا شروع کیا۔ اردو ہندی کی اس محفل میں نووستی پریس ایجنسی کی نمائندہ گلینا اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہی تھیں۔ بڑا عجیب و غریب منظر تھا۔ یہ محفل جاری ہی تھی کہ ڈاکٹر نامور سنگھ، ڈاکٹر قمر رئیس اور پروفیسر کرپ تشریف لے آئے۔ قمر رئیس پوپووانینا اور سازانووا کو پہلے سے جانتے تھے۔ اب یہ محفل ایک بزمِ بے تکلفاں میں تبدیل ہو گئی۔ تھوڑی دیر کی بات چیت کے بعد پروفیسر الیکسی اونوف ہم لوگوں کو اس ہال میں لے چلے جہاں کوئی ساٹھ ستر کے قریب طلبہ ہمارے منتظر تھے۔ تمام ہندستانی زبانوں کے طالب علم تھے۔ انگریزی سب جانتے تھے۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں آٹھ جدید ہندستانی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اردو، ہندی، پنجابی، بنگالی، مراٹھی، تامل، نیپالی اور سنگھالی۔ اس کے علاوہ دو قدیم زبانیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ سنسکرت اور پالی۔ تیس زبانیں دوسرے ملکوں کی

نصاب میں شامل ہیں۔ گویا غیر ملکی زبانوں کی تعداد چالیس ہے۔ جس ملک کی زبان پڑھائی جاتی ہے وہاں کی تاریخ اور اقتصادیات سے بھی طلبہ کو واقفیت بہم پہنچائی جاتی ہے۔

ایک زبان جاننے کے لیے پانچ سال کی مدت مقرر کی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک سال اس مقصد کے لیے رکھا گیا ہے کہ طالب علم جس ملک کی زبان پڑھ رہا ہے اس ملک میں جا کر وہاں کے لوگوں سے ملے اور بول چال کی زبان سیکھے۔

ہال میں پہنچے تو طلبہ اور طالبات نے کھڑے ہو کر ہمارا اور اپنے اساتذہ کا استقبال کیا۔ پروفیسر الیکسی اونوف نے ہم چاروں ہندستانی اساتذہ کا تعارف کرایا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر قمر رئیس نے تقریر کی۔ عنوان تھا MODERN URDU LITERATURE (جدید اردو ادب)۔ ان کے بعد پروفیسر کرپ نے ملیالم ادب پر اظہار خیال کیا۔ مجھے چوں کہ پہلے سے دعوت نامہ مل چکا تھا اس لیے میں اپنا پندرہ منٹ کا مقالہ لکھ کے لے گیا تھا۔ عنوان تھا ——— IQBAL'S VISION OF THE NEW MAN یہ مقالہ اور اول الذکر دونوں تقریریں انگریزی میں تھیں۔ ڈاکٹر نامور سنگھ نے ہندی میں تقریر کی اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں اردو اور ہندی کی تعلیم پر روشنی ڈالی اور دونوں زبانوں میں اور زیادہ ہم آہنگی پیدا کرنے پر زور دیا۔

اس پروگرام کے بعد ہم لوگ پروفیسر الیکسی اونوف کے کمرے میں واپس آئے۔ وہاں چائے کا دور چلا۔ چائے پر انسٹی ٹیوٹ کے ریکٹر پروفیسر آکراموف بھی شریک ہوئے۔ یہ انگریزی نہیں جانتے اس لیے پروفیسر الیکسی اونوف نے ان کے لیے مترجم کا کام کیا۔

اس ساری محفل میں مجھے اول سے آخر تک ایک کمی محسوس ہوتی رہی اور وہ کمی تھی پریگارینا نتاشا کی عدم موجودگی۔ پروفیسر سازانووا نے انھیں آج کی محفل کے متعلق بتایا تھا اور نتاشا نے کہا تھا کہ میں آزاد ملنے ضرور آؤں گی کیوں کہ ہم دونوں کا موضوع ایک ہے۔ نتاشا اقبال پر دو کتابیں لکھ چکی ہیں۔ اسی اشتراکِ موضوع کے باعث مجھے بھی اُن کے ساتھ اشتیاقِ ملاقات تھا مگر وہ اس جلسے میں نہ پہنچیں۔ پروفیسر پچووا نے کہا کہ اگلے دن وہ ہم لوگوں کو اپنے گھر پر دعوت دے رہی ہیں، نتاشا وہاں موجود ہوں گی۔

اسی چائے کے دوران میں ڈاکٹر پچووا نے ایک روسی طالب علم سے ملوایا جو اقبال پر مقالہ لکھ رہا تھا۔ اس طالب علم کے ساتھ مختصر سی بات چیت رہی۔ وہ اقبال کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر مفصل بحث کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس کے ساتھ اگلے دن کا وقت مقرر ہوا۔

چھے بجے یہاں سے فارغ ہوئے۔ ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر نامور سنگھ اور پروفیسر کرپ اپنے پروگرام کے مطابق غالباً "تالستائی میوزیم" دیکھنے چلے گئے اور میں نے الیگزینڈر کے ہمراہ ۱۸۱۲ء کی جنگِ بوروڈینو پر مبنی پینوراما میوزیم کا رخ کیا۔ اس پینوراما میوزیم کو لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ یہ ایسی چیز ہے جس کا تعلق صرف دیکھنے سے ہے۔ ایک چھوٹے سے گول کمرے میں داخل ہوتے ہی گمان ہوتا ہے کہ ہم میدانِ جنگ میں آ گئے ہیں اور جہاں تک نظر کام کرتی ہے جنگ کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ فوجی گھڑ سوار اور گھوڑے زخمی پڑے ہیں، مرے پڑے ہیں، نپولین گھوڑے پر سوار ہے اور اپنی فوجوں کو لیے ہوئے ماسکو پر حملہ کر رہا ہے۔ روسی فوجیں جنرل کتوزف

کی زیر سرکردگی اس حملے کا منہ توڑ جواب دے رہی ہیں۔ مکانوں میں آگ لگی ہے۔ ٹوٹی ہوئی توپیں، بندوقیں میدانِ جنگ میں بکھری پڑی ہیں۔ بتایا یہ گیا کہ تیرہ میٹر کے اندر اندر جو کچھ نظر آرہا ہے وہ تو واقعی ٹھوس چیزیں ہیں۔ اس کے بعد تین چار میل تک جو کچھ دکھائی دے رہا ہے وہ محض پینٹنگ ہے۔ یا مظہر العجائب! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ پینٹنگ فریب نظر میں یوں بھی تبدیل ہوسکتی ہے۔

بالکل ایسا ہی پینارہ ما میں نے سولہ برس قبل بلجیم میں دیکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اور دونوں تعریف سے ماوراء ہیں۔

پینارما کی عمارت سے باہر نکلے تو بارش ہو رہی تھی۔ دیر بھی ہوگئی تھی۔ آٹھ بج چکے تھے چنانچہ ہم لوگ ہوٹل واپس آگئے۔ الیگزینڈر نے مجھ سے پاسپورٹ اور ویزا لیا تاکہ اس میں ریگا اور لینن گراڈ کا اندراج کرالیا جائے۔ وہ رخصت ہوئے تو میری نگاہیں بھیجے بھیجتے ہوئے دریائے ماسکو پر جم گئیں جس میں اسٹیمر بقعۂ نور بنے ہوئے آجارہے تھے۔ نہ جانے میں کب تک اس منظر کو دیکھتا رہا۔

▲

(۶)

سفارت خانے سے بالشائے تھیٹر تک

صبح اٹھا، ڈائری پر نظر ڈالی۔ پروگرام خاصا بھرپور قسم کا تھا۔ صبح کریملن کی سیر، دوپہر میں گجرال صاحب کی طرف سے کھانے کی دعوت، ساڑھے تین بجے پروگریس پبلشرز کے دفتر میں انیسف صاحب، حبیب الرحمٰن صاحب، اشفاق صاحب، تقی حیدر صاحب اور مدھوجی سے ملاقات، پانچ بجے بالشائے تھیٹر میں تالستائی صدی تقاریب میں شرکت۔ اس وقت تک الیگزینڈر سے دوستی ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

ڈائری دیکھ ہی رہا تھا کہ پروفیسر چیلی شیو کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے پہلے "السلام علیکم" کہا۔ پھر صاف شستہ اردو میں بات شروع کی۔ میری اُن کے ساتھ دہلی اور لاہور میں ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ چوں کہ لہجہ روسی تھا میں پہچان گیا کہ چیلی شیو ہیں۔ انھوں نے گلہ کیا کہ آپ ماسکو آئے ہیں اور مجھے ٹیلی فون تک نہیں کیا۔ مجھے قمر رئیس نے آپ کی آمد کی اطلاع دی ہے۔ میں نے معذرت چاہی اور کہا کہ آپ کا ٹیلی فون نمبر میرے پاس نہیں تھا۔ ویسے میں پہلے دن ہی ڈاکٹر گاندھی سے کہہ چکا ہوں کہ آپ سے اور آپ کی شاگرد نتاشا سے ملاقات کرائیں۔ بولے مجھے آپ کا ٹیلی فون نمبر ڈاکٹر گاندھی ہی نے دیا ہے۔ آپ ڈاکٹر نامور سنگھ، ڈاکٹر قمر رئیس پروفیسر جوشی اور پروفیسر کرپ میرے انسٹی ٹیوٹ میں تین بجے آئیے۔ میں نے نتاشا سے بھی کہہ دیا ہے، وہ بھی ہوں گی۔ میں نے ڈائری دیکھی اس میں ساڑھے تین بجے پروفیسر انیسف کے ساتھ وقت ملاقات طے تھا، پروگریس پبلشرز کے دفتر میں۔ ڈیڑھ بجے لنچ شروع ہو رہا تھا۔ میں نے کہا لنچ سے فارغ ہوکے میں بہ مشکل ساڑھے تین بجے پروفیسر انیسف کے یہاں پہنچ سکوں گا۔ یہ تین بجے کا وقت طے کرکے تو آپ نے میرے لیے مشکل پیدا کر دی۔ پہلے تو انھوں نے کہا کہ آپ انیسف سے کہہ دیں کہ وہ بھی میرے یہاں تین بجے آجائیں لیکن میرے یہ کہنے پر کہ پروگریس پبلشرز کے دفتر میں اشفاق صاحب، حبیب الرحمٰن صاحب، تقی حیدر صاحب اور مدھوجی سے بھی ملاقات ہوگی بولے تو پھر پرسوں آپ ریگا جا رہے ہیں، کل سنیچر وار ہے، ہمارے یہاں کل بھی چھٹی ہوگی۔ پھر نتاشا سے آپ کی ملاقات کب کرائی جائے۔ "اقبال" آپ دونوں کا موضوع ہے۔ اقبال پر

ان کی دوسری کتاب کسی بھی غیر ملکی کے لیے باعث فخر ہو سکتی ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے کہا کہ اُن کے ساتھ اور آپ کے ساتھ بھی میرا اشتیاق ملاقات کم نہیں لیکن صورت کیا ہو۔ بولے کہ پھر کل اور پرسوں تو ممکن نہیں ہوگا۔ آپ ریگا اور لینن گراڈ سے واپس آجائیں تو دیکھیں گے۔ پھر خود ہی کہنے لگے کہ مادام پیپو وا کہہ رہی تھیں وہ آپ کو اپنے گھر پر دعوت دے رہی ہیں۔ نتاشا کو بھی وہ وہاں بلا رہی ہیں۔ میں نے کہا پیپووا نے اپنے گھر دعوت دینے کی کل بات تو کی تھی لیکن نہ تاریخ بتائی نہ وقت چنانچہ میں نے ان سے کہہ دیا کہ اچھا میں تین بجے آپ کے یہاں آ رہا ہوں، نتاشا سے کہہ دیجیے۔ ایلیف کے وہاں چار بجے تک پہنچنے کی گنجائش پہلے ہی پروگرام میں رکھ دی گئی تھی۔

ٹیلی فون ختم ہوا تو الیگزینڈر آگئے میں نے انھیں چیلی شیو کے ٹیلی فون کی روداد کہہ سنائی اور کہا کہ پیپو وا نے اپنے گھر دعوت دینے کی ادھوری بات کی ورنہ نتاشا سے ملاقات وہیں ہو جاتی۔ بولے پیپووا کی طرف سے دعوت کل سہ پہر کے چار بجے ہے،، انھوں نے مجھ سے طے کر لیا تھا لیکن اب چیلی شیو سے ملاقات کے لیے تین بجے کا وقت طے ہو چکا تھا۔ میں نے پروگرام میں زیادہ گڑ بڑ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

کل دن میں چائے کے کچھ زیادہ ہی دور چلتے رہے اس لیے رات کو نیند ٹھیک سے نہیں آئی، صبح دیر میں آنکھ کھلی۔ طبیعت میں کسل مندی ہونے کے باعث تیاری میں بھی خاصی دیر لگی۔ الیگزینڈر آئے تو میرا ٹکٹ لے کے ایرو فلوٹ کے دفتر چلے گئے اور ایر انڈیا کی فلائٹ سے ۲۳ ستمبر کی بکنگ کرا کے لے آئے۔ گھڑی دیکھی تو ساڑھے بارہ کا وقت تھا۔ ڈیڑھ بجے ہندستانی سفارت خانے میں لنچ تھا۔ اب ایک گھنٹے میں کریملن کو دیکھنا ممکن نہیں تھا اس لیے ہوٹل کے اندر ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور دیکھنے چلے جو غیر ملکیوں کے لیے تھا وہاں پرفیوم خریدا۔ قیمت تھی بارہ روبل، میں نے غلطی سے بارہ ڈالر سمجھا۔ جب دام دیے تو سیلز گرل نے تقریباً اٹھارہ ڈالر لیے۔ اس کے بعد مزید شاپنگ کی ہمت نہ ہوئی اور اسٹور سے باہر آگئے۔ یہ درآمد شدہ اشیا کا اسٹور تھا۔ کریملن کے سامنے روس کے اپنے ساز و سامان سے بھرا ایک اور اسٹور تھا، گم اسٹور۔ اس کے اندر جا کے سیر کی۔ یہاں اشیا کی قیمت روبل میں ادا کی جاتی ہے لیکن روبل میرے پاس ختم ہو رہے تھے۔ سوچا کہیں کھانے یا چائے کے لیے وقت پیدا نہ ہو چناں چہ "بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں" کے مصداق اسٹور میں گھوم پھر کے باہر آگیا۔ اب کھانے کا وقت ہو چلا تھا، اپنے سفارت خانے کا رخ کیا۔ وہاں پروفیسر جوشی، ڈاکٹر نامور سنگھ، ڈاکٹر قمر رئیس اور پروفیسر کرپ پہلے سے پہنچ چکے تھے۔ گجرال صاحب ایک میٹنگ میں گئے ہوئے تھے، تھوڑی دیر میں واپس آگئے۔ گپ شپ کا سلسلہ چل نکلا۔ کھانے کی میز پر بیٹھے۔ ہندستانی کھانا دیکھ کے جی خوش ہو گیا۔ سوموار کی رات کو ڈاکٹر گاندھی کے ہاں ہندستانی کھانا کھایا تھا۔ اب چار دن بعد پھر اس سے لذت اندوز ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ میں کچھ زیادہ ہی کھا گیا۔ رات تک بھوک نہ لگی۔ کھانے کے دوران میں گجرال صاحب نے "پیٹریاٹ" کے ایڈیٹر نارائنن کے انتقال کی خبر سنائی۔ بہت دکھ ہوا۔

وہاں سے پھر ماسکو یونی ورسٹی کا رخ کیا۔ اب کے منزل مقصود انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز اکیڈیمی آف سائنسز تھی۔ مقصد پروفیسر چیلی شیو اور نتاشا سے ملاقات کرنا تھا۔ یونی ورسٹی میں داخل ہوا تو لڈمیلا یوسلیوا دروازے پر موجود تھیں۔ نہایت شیریں لب و لہجہ میں بولیں "آزاد صاحب، آداب عرض۔ آپ نے دیر کر دی چلیے اندر آپ کا انتظار ہو رہا ہے"۔ پھر فوراً ہی کہنے لگیں آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا، میں وہی ہوں جسے آپ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ میں سری نگر میں آپ سے ملی تھی، ریڈیو اسٹیشن کے قریب۔ میرا نام لڈمیلا یوسلیوا ہے"۔ میں نے کہا یہ بات نہیں ہے کہ پہچانا نہیں ہے۔ اس وقت فراق کا ایک شعر یاد آ رہا ہے

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

اتنے میں "ماسکو نیوز" کے نمایندے یوری اسوچ نے جو وہیں کھڑے تھے اپنے ہفتہ وار کے لیے میرے تاثرات پر مبنی ایک مقالے کی فرمائش کی۔ یوسلیوا نے مداخلت کی کہ مقالے کی بات پھر ہوگی، اس وقت انسٹی ٹیوٹ میں آزاد کا انتظار ہو رہا ہے اور وہ مجھے لے کے انسٹی ٹیوٹ میں آگئیں جہاں چیلی شیو اور پریگارینا نتاشا کے علاوہ اکثر اساتذہ اور طلبہ و طالبات سے ملاقات ہوئی۔ چیلی شیو بڑے تپاک سے ملے۔ روسی ادیب جس محبت اور تپاک سے مل رہے تھے اس سے مجھے دلی مسرت ہو رہی تھی۔ پروفیسر چیلی شیو نے پریگارینا نتاشا سے تعارف کرایا۔ میں نے کہا انھی سے شوق ملاقات تو یہاں لایا ہے۔ پریگارینا جھینپ گئیں۔ روسی ادیب علم کا غرور نہیں رکھتے اور جب اُن کے علم و فضل کی تعریف کی جائے تو شرما سے جاتے ہیں۔ یہ ہم ہندستان کے اردو اہل قلم ہیں جو اپنے آپ کو ہند و پاکستان کا محبوب شاعر اور ایشیا کا عظیم فن کار کہتے نہیں تھکتے۔ پریگارینا نے اقبال پر اپنی دونوں کتابیں مرحمت کیں لیکن کتابیں روسی زبان میں ہیں۔ افسوس کہ میں ان کو پڑھنے سے معذور ہوں۔ چنانچہ میں نے یہ دونوں کتابیں اپنے دوست پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو بھیج دی ہیں' وہ' ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر حسن اختر اور ڈاکٹر سلیم اختر کے ساتھ مل کے اقبال کے متعلق ہر زبان کی کتابوں پر مشتمل لاہور میں ایک لائبریری کی تشکیل کر رہے ہیں۔ یوسلیوا نے ان کی نئی کتاب کی فہرست مضامین کا اردو میں ترجمہ کر کے مجھے سنایا۔ بعض عنوانات سے واقعی نیاپن جھلکتا تھا مثلاً اقبال کا تصور ملت زمان و مکان کے پس منظر میں"۔ میں نے کہا اس عنوان پر بحث کا نقطۂ آغاز آپ کو "رموز بے خودی" میں ملا ہوگا جس میں اقبال لکھتے ہیں: "در معنی ایں کہ چوں ملت محمدیہ موسس بر توحید و رسالت است پس نہایت مکانی ندارد" اور "در معنی ایں کہ ملت محمدیہ نہایت زمانی ہم ندارد کہ دوام ایں ملت شریفہ موعود است" لیکن ان دونوں ابواب میں اقبال نے زمان و مکان پر گہری بحث نہیں کی۔ ان ابواب میں اقبال نے بحث کو صرف یہیں تک محدود رکھا ہے کہ ملت کی بنیاد وطن نہیں ہے اور ملت اسلامیہ کو دوام حاصل ہے۔ گویا اقبال نے اپنے نظریۂ زمان و مکان کو ان مباحث میں بہت کر دیا ہے۔ اقبال نے اس نظریہ پر گہری بحث "جاوید نامہ"

اور The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں کی ہے۔
پریگارینا نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ ابھی بات چیت نے کوئی رخ متعین نہیں کیا تھا کہ ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر کرپ اور ڈاکٹر نامور سنگھ آ گئے چنانچہ پروفیسر چیلی شیو نے ان کے ساتھ مجھے بھی ڈائس پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد انھوں نے نہایت شستہ ہندی آمیز اردو میں استقبالیہ تقریر کی اور بحث کے لیے ایک موضوع پیش کیا۔ ابھی اس پر بات چیت شروع ہی نہیں ہوئی تھی کہ میرے INTERPRETER نے آکے میرے کان میں کہا کہ پونے چار بج گئے ہیں اور پروگریس پبلشرز میں پروفیسر انیسف آپ کے منتظر ہیں۔ چنانچہ بات چیت شروع ہونے سے پہلے ہی میں اجازت طلب ہوا۔ پروفیسر چیلی شیو میری اور نتاشا کی اقبال پر گفتگو کے بہت متمنی تھے۔ میں چلنے لگا تو ریسلیوا نے کہا کہ میں اور نتاشا کل چار بجے پروفیسر پچوداکی دعوت میں آپ سے ملیں گی اور اس موضوع پر مفصل بات چیت ہوگی۔ میں بادلِ ناخواستہ اس محفل سے رخصت ہوا اور نہال سیوہاروی کا یہ شعر میری زبان پر تھا۔

کتنے باقی ہیں مہمات جہاں تیز چلو
چلنے والو! بصفت عمرِ رواں تیز چلو

باہر گاڑی موجود تھی۔ دس منٹ میں ہم پروگریس پبلشرز کے دفتر میں پہنچ گئے۔ وہاں پروفیسر انیسف اور شعبۂ ہندی کے مدعوجی میرے منتظر تھے۔ انیسف کا نام پتا اور ٹیلی فون نمبر مجھے ظ انصاری نے دیا تھا۔ ظ نے ڈاکٹر سنوچوف کا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی دیا تھا اور ان کے لیے اپنی کتاب بھی، لیکن اس سفر میں سنوچوف سے ملاقات نہ ہو سکی کیوں کہ وہ چھٹی پر تھے اور میری ہندستان روانگی کے بعد ماسکو واپس آرہے تھے۔ اُن کے لیے کتاب میں نے الیگزینڈر کو دے دی کہ جب وہ ماسکو آئیں تو انھیں دے دیں۔

اس وقت چار بج چکے تھے۔ پانچ بجے بالشائے تھیٹر میں تالستائی صدی تقاریب کا آغاز ہو رہا تھا۔ صرف ایک گھنٹہ ہمارے پاس تھا اور الیگزینڈر مجھے اپنے گھر چائے پر مدعو کر چکے تھے۔ چنانچہ تھوڑی دیر ان کے ساتھ بیٹھ کے میں الیگزینڈر کے ہمراہ ان کے گھر گیا۔ وہاں زیادہ بیٹھنے کا وقت نہیں تھا۔ ان کی بیوی اور بچوں سے ملا۔ ایک چھوٹا سا تحفہ ان کی بیوی سوتیانا کو دیا، چائے پی اور بالشائے تھیٹر کا رخ کیا۔

بالشائے تھیٹر ماسکو کا سب سے بڑا تھیٹر ہے۔ اس سے پہلے اسی جگہ پر پٹروسکی پبلک تھیٹر نام کا ایک تھیٹر تھا جس کا افتتاح ۱۷۸۰ء میں ہوا تھا۔ یہ آگ کی نذر ہو گیا اور اس کی جگہ ایک نئی عمارت وجود میں آئی جو آج بالشائے تھیٹر کے نام سے مشہور ہے۔

بالشائے تھیٹر یوں تو ہمارے وگیان بھون سے بڑا نہیں ہے لیکن کرسیوں کا درمیانی فاصلہ اور کرسیوں کی قطاروں کا درمیانی فاصلہ چوں کہ کم ہے اس لیے اس میں مقابلتاً حاضرین کی زیادہ تعداد سما سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈائس کے دائیں بائیں اور سامنے اوپر نیچے چھ طویل و عریض گیلریاں بنی ہیں جن میں کم سے کم پانچ چھ ہزار تماشائی بیٹھ سکتے ہیں۔ کوئی پانچ چھ ہزار ہال کے اندر فرش پر رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ سکتے ہوں گے۔ اس طرح دس ہزار تماشائیوں

کے بہ یک وقت بیٹھنے کا انتظام ہے۔ سامنے کی گیلری میں دوسری اور تیسری منزل پر پھیلی ہوئی زار روس کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ کسی زمانے میں یہاں تخت رکھا رہتا ہوگا۔ آج یہاں سرکاری افسر بیٹھتے ہیں۔

صدی تقاریب کے افتتاحی اجلاس کی صدارت گیورگی مارکوف نے کی جو روس کے ایک نامور شاعر ہیں اور سوویٹ رائٹرز یونین کے فرسٹ سکریٹری ہیں۔ افتتاح بھی گیورگی مارکوف نے کیا۔ صدرِ مملکت برزنیف اور وزیر اعظم کوسی گن دونوں موجود تھے اور وزیر دفاع گریچکو بھی لیکن صدارت کا اعزاز ایک شاعر کو حاصل ہوا اور تقریریں بھی صرف ادیبوں اور شاعروں نے کیں۔ کمیونسٹ پارٹی تولا کے فرسٹ سکریٹری کے علاوہ کسی سیاسی شخصیت کو محض عہدے کی بنا پر تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ غالباً تولا کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کا نام اس لیے مقررین کی فہرست میں شامل تھا کہ تالستائی کا شہر یاسنا پالیانا ضلع تولا میں ہے اور تولا کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کو یاسنا پالیانا کی نمائندگی کا حق حاصل تھا۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ یاسنا پالیانا کے تالستائی میوزیم کو آرڈر آف لینن کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

زیادہ تر مقررین روس کے تھے۔ باہر کے صرف تین ملکوں کے نمائندوں کو تقریر کے لیے کہا گیا۔ بلگیریا، ارجنٹائنا اور ہندستان۔ ہندستان کی نمائندگی کا شرف ساہتیہ اکیڈیمی کے صدر پروفیسر اوماشنکر جوشی کو حاصل ہوا۔ انھوں نے ہندی میں مختصر سی تقریر کی جس کا ترجمہ مریم سالگینک نے کر کے سنایا۔ مجھے اس موقعے پر پاکستان میں منعقدہ اقبال صدی تقاریب کی یاد آگئی جس میں شرکت کے لیے باہر سے آئے ہوئے اسّی ملکوں کے مندوبین میں سے جب تقریروں کے لیے سات مندوبین کا انتخاب کیا گیا تو ہندستان اس میں شامل تھا اور جب سیالکوٹ میں اقبال عالمی کانگرس کا اختتامی اجلاس ہوا تو بھی ایک ہندستانی مندوب کو اس کی صدارت کا شرف حاصل ہوا۔ میرے وطن عزیز ہندستان جنت نشان! میری دعا ہے کہ دنیا کے ملکوں کی نظر میں تیرا وقار اور مرتبہ اسی طرح قائم رہے بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے!

تقریروں کے بعد رقص و نغمہ کا پروگرام شروع ہوا۔ ابتدا مشہور روسی مغنی بورڈوزین کی سمفنی سے ہوئی۔ اس کے بعد تالستائی کے متعلق لینن کا ایک مقالہ پڑھا گیا۔ تالستائی کی تصنیف War And Peace کی جھلکیاں اوپیرا کی صورت میں دکھائی گئیں۔ روسی بیلے بھی پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ اور بہت کچھ تھا جو سمجھ میں نہ آیا کیوں کہ "زبان یار من روسی، و من روسی نمی دانم" والا معاملہ تھا۔

۷

کریملن اور لینن کا مقبرہ

اگلی صبح کو جاگا تو طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔ اگرچہ اس سے پہلی رات سویا بہت دیر میں تھا کیوں کہ دیر تک "ماسکو نیوز" کے لیے مطلوبہ مقالہ بہ عنوان INDO-SOVIET FRIENDSHIP لکھتا رہا لیکن جب سویا تو گہری نیند آ گئی اس لیے صبح کو طبیعت بشاشش تھی۔ دریائے ماسکو پر نظر ڈالی تو اسٹیمروں نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ ایک دن قبل دس گیارہ بجے صبح تک مجھے اس میں کوئی اسٹیمر رکھا نظر نہ آیا تو مجھے اس دریا میں ایک کمی سی محسوس ہوئی۔ اسٹیمر کو دریا یا سمندر میں چلتا دیکھ کر اور طیارے کو آسمان میں اڑتا دیکھ کر آج بھی جب کہ میری عمر انسٹھ سے تجاوز کر گئی ہے مجھے وہی لطف آتے لگتا ہے جو بچپن میں انھیں دیکھ کے آتا تھا۔ اگرچہ میں بحری اور ہوائی جہاز میں اس وقت تک ہزاروں میل یا شاید اس سے بھی زیادہ سفر کر چکا ہوں گا لیکن میری اس کیفیت میں کمی نہیں آتی۔ بحری جہاز یا طیارے میں سفر کر کے وہ مزہ نہیں ملتا جو باہر سے ان کو دریا یا سمندر میں تیرتے یا آسمان پر اڑتے دیکھ کے ملتا ہے۔ ایک دن پہلے کی گم شدہ متاع آج پھر ہاتھ آ گئی تھی۔ اور الیگزینڈر کے آنے تک میں اسی منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

الیگزینڈر نے آ کے بتایا کہ ریگا اور لینن گراڈ کی بکنگ ہو گئی ہے۔ اتوار (۱۰ ستمبر) کی شام کو ماسکو سے روانہ ہونے کا پروگرام تھا۔ ۱۱ اور ۱۲ ستمبر ریگا میں ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ لینن گراڈ میں اور ۱۶ کی صبح کو ماسکو واپسی۔

اس روز کریملن کی سیر اور لینن کے مقبرے پر جانے کا پروگرام تھا۔ دونوں ہی ہوٹل سے ڈیڑھ قدم پر تھے۔ سڑک کے اس پار پہلے لینن کے مقبرے کو دیکھنے کا ارادہ کیا۔ پہنچے تو کیو (Queue) کی لمبائی کو دیکھ کے میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کیو سارے ریڈ اسکوئر سے ہو کے الیگزینڈر پارک میں نظروں سے غائب ہو رہا تھا۔ ایک میل سے کم اس کی لمبائی کیا ہو گی اور پھر یہ بھی نہیں کہ ایک فرد کے پیچھے دوسرا فرد ہو۔ کیو کی چوڑائی دو اور بعض جگہوں پر تین افراد پر مشتمل تھی۔ اس کیو میں اگر سب کے پیچھے کھڑا ہونا پڑتا تو اس روز مقبرے میں داخل ہونے کی باری آنے کا کوئی

امکان نہیں تھا۔ الیگزینڈر نے دو ایک ملشیا افسروں سے کہا کہ یہ ہندستان سے آئے ہوئے شاعر ہیں اور سوویت رائٹرز یونین کے مہمان ہیں۔ ان افسروں نے مجھے مقبرے کے قریب ہی کیو میں ایک جگہ کھڑے ہونے کی اجازت دے دی۔ یہ رعایت غیر ملکی مہمانوں کو اکثر مل جاتی ہے۔ خود روس میں ایک طبقہ ایسا ہے جسے لینن کی زیارت کرنے کے لیے اس سے بھی زیادہ رعایت حاصل ہے اور وہ دلہنوں کا طبقہ ہے۔ ہر نئی بیاہی لڑکی اپنا یہ فرض سمجھتی ہے کہ پہلے ہی دن لینن کے مقبرے پر جائے۔ ان کے لیے کیو میں کھڑا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ موٹر سے اتر کے اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دوسرے رشتے داروں سمیت کیو سے بے نیاز ہو کر سیدھے مقبرے پر پہنچ جاتی ہیں۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ ہر ایک ڈیڑھ منٹ کے بعد ایک نیا بیاہتا جوڑا کیو سے الگ مقبرے کی طرف جا رہا ہے۔ ہاں مقبرے میں داخل ہونے سے قبل انھیں کیو میں شامل ہونا پڑتا ہے کیوں کہ مقبرے میں داخل ہونے اور باہر نکلنے تک خاموشی کے ساتھ کیو میں چلنا ضروری ہے۔

مقبرے میں داخل ہوئے تو پہلے اندھیرے سے سابقہ پڑا۔ سیڑھیاں کافی نیچے اترتی چلی گئیں۔ پھر دو بار دائیں طرف کا چکر کاٹ کر اوپر سیڑھیاں چڑھنا شروع کیا۔ دو ایک سیڑھیاں چڑھے ہوں گے کہ بائیں طرف ایک پلیٹ فارم پر شیشے کے بکس میں لینن کی لاش محوِ استراحت نظر آئی۔ اوپر سے اس پر اتنی روشنی پڑ رہی تھی کہ چہرے کے تمام نقوش واضح تھے۔ صرف سر اور چہرہ گردن تک اور ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ باقی جسم غالباً ایک چیتل کی چادر میں ڈھکا تھا۔ میں نے اس طرح سے کسی لاش کو زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ بہت متاثر ہوا۔ باہر آئے تو مقبرے کے پیچھے کریملن کی دیوار کے ساتھ روس کے متعدد لیڈروں، جرنیلوں، عالموں اور شاعروں کی قبریں نظر آئیں۔ جو زیادہ بڑے لیڈر تھے اُن کے مجسمے بھی قبروں کے اوپر بنے ہوئے تھے۔ اسٹالن کا مجسمہ بھی اس کی قبر کے اوپر روس کے بعض دوسرے لیڈروں کے ساتھ بنا ہوا نظر آیا۔

لینن کے مقبرے اور دوسرے عظیم روسی رہنماؤں کی قبروں کی زیارت کے بعد ہم لوگ کریملن میں داخل ہوئے۔ کریملن زار شاہی کے زمانے کی یادگار ہے۔ جس میں لینن ایک فاتح کے طور پر ۱۲ مارچ ۱۹۱۸ء کو دن کے ۱۲ بجے پوری پرولتاری شان کے ساتھ داخل ہوا۔ آج کریملن روسی کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کے اہم ترین دفاتر سے آباد ہے۔ ماسکو اگر سارے روس کا دل ہے تو کریملن ماسکو کا دل ہے اور کریملن کو دیکھے بغیر ماسکو سے واپس جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص راشٹرپتی بھون، سنٹرل سیکریٹریٹ اور لال قلعہ دیکھے بغیر دہلی سے واپس چلا جائے۔

کریملن کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ تاریخ بارھویں صدی سے شروع ہوتی ہے اور اس کی عمارتیں دیکھ کر دل پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو دہلی کا لال قلعہ، لاہور کا قلعہ، یا آگرے کا قلعہ دیکھ کر۔ فرق صرف اتنا ہے کہ متذکرہ بالا قلعے

آج صرف تاریخی نشانیاں بن کے رہ گئی ہیں اور کریملن ایک تاریخی یادگار ہونے کے ساتھ ہی ساتھ حکومتِ روس کا جیتا جاگتا صدر دفتر بھی ہے۔

ہم لوگ کریملن میں ٹرائسکی گیٹ سے داخل ہوئے اور اس کی مختلف عمارتیں اور کیتھیڈرل دیکھتے ہوئے کوئی دو گھنٹے کے بعد بوردوشکی گیٹ سے باہر واپس آگئے۔

▲

۸

ذکرِ اقبال

چار بجے مادام پوپاوا نینا کی طرف سے دعوت تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک طالبہ اور ایک طالب علم، ایرا اور نجا کا نچلی منزل سے ٹیلی فون آیا۔ ایرا کہہ رہی تھی ہم ماسکو یونی ورسٹی میں پڑھتے ہیں اور آپ کو پروفیسر نینا کے گھر لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ میں اور الگیزینڈر نیچے اترے اور تھوڑی دیر میں پروفیسر نینا کے گھر جا پہنچے۔ نینا بڑے تپاک سے ملیں۔ اپنے بیٹے لیوسے انھوں نے ملوایا جس کے بارے میں علم ہوا کہ وہ اپنی ماں کو سگریٹ نہیں پینے دیتا۔ اس بات پر بہت دیر تک ہنسی مذاق چلتا رہا۔ جب ہم لوگ گاڑی میں جا رہے تھے تو میرے پوچھنے پر ایرا نے بتایا کہ وہ اقبال کی مثنوی "گلشنِ رازِ جدید" پر تھیسس لکھ رہی ہے اور نجا نے بتایا کہ وہ "ضربِ کلیم" اور "فریادِ امت" پر کام کر رہا ہے۔ میں نے کہا پھر ہم آپ اُردو میں کیوں نہ بات کریں۔ لیکن اردو وہ دونوں بہت اٹک اٹک کر بول رہے تھے۔ وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ انھیں اردو بولنے کی مشق نہیں ہے۔ فارسی دونوں اچھی بول لیتے تھے۔ ان کی استانی پریگارینا بھی فارسی رواں بولتی ہیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر فارسی میں بات چیت رہی لیکن میں چوں کہ خود جدید فارسی سے آشنا نہیں ہوں اس لیے میرے لیے وہ دقت موجود رہی جو ایرا اور نجا کے لیے اردو میں بات چیت کرتے وقت پیدا ہو گئی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فارسی میں بات چیت اُردو کے مقابلے میں بہتر رہی۔

پروفیسر پوپاوا کا مکان بہت ہی شان دار ہے۔ چار بیڈ روم کا مکان ہے۔ ہر کمرے میں کتابوں کے ریک اور الماریاں لگی ہیں۔ ڈرائنگ کم ڈائننگ روم میں بھی۔ میں نے سوچا جتوں میں میری بیوی اس صورتِ حال سے نالاں ہے۔ یہاں ان کا شوہر نالاں ہوگا لیکن پتا چلا کہ ان کے شوہر "ماسکو نیوز" کے اڈیٹر ہیں اور ان میں کچھ کتابیں ان کی بھی ہوں گی۔

پوپاوا نے بات چیت اردو میں شروع کی۔ تھوڑی دیر میں پریگارینا بھی آگئیں اور اردو کی محفل کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ میں، پریگارینا، پوپاوا، ایرا اور نجا ہم سب اردو جانتے تھے۔ ایک الگیزینڈر اور ایک لیو اس محفل میں اردو سے ناآشنا تھے۔ ان دونوں کی خاطر ہم سب بعض دفعہ انگریزی میں بات چیت شروع کر دیتے تھے۔ پوپاوا کی اسٹڈی دیکھی۔ اس میں اردو

کی متعدد کتابیں نظر آئیں۔ اقبال، پریم چند، جوش، فیض، سجاد ظہیر، آل احمد سرور، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، فراق، محروم، احتشام حسین، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، محمد طفیل، ظ انصاری، مخدوم محی الدین، محمد حسن، قمر رئیس، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی اور راقم التحریر کی اکثر کتابیں وہاں موجود تھیں۔ مجھے اپنی کتابوں میں نثر کی تو متعدد کتابیں نظر آئیں لیکن مجموعۂ کلام کوئی نظر نہ آیا۔ یہ دیکھ کے مجھے خلیل الرحمٰن اعظمی کا وہ آخری خط یاد آگیا جس میں انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ آپ نے نثر میں بالخصوص اقبال پر جس انداز سے لکھنا شروع کیا ہے اس سے اندیشہ ہے کہ کہیں لوگ بطور شاعر کے آپ کو فراموش نہ کر دیں۔ اس کی ایک جھلک میں نے پوپاوا کے گھر میں دیکھ لی۔

میں اور الگیزینڈر پوپاوا کے گھر میں آکے بیٹھے ہی تھے کہ پوپاوا نے ایک بوتل واڈکا کی اور ایک وسکی کی سامنے لاکر رکھ دی اور پانچ سات گلاس۔ میں نے کہا وسکی تو چل جائے گی لیکن واڈکا نہیں چل سکے گی۔ کیوں کہ اس کے پینے کے آداب میرے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ نہیں رہے۔ پوپاوا نے کہا کہ شروع میں تو واڈکا آپ کو لینا ہی ہو گی۔ چنانچہ میں ایک پیگ واڈکا کا لینے کے بعد وسکی کی طرف ملتفت ہوا اور وسکی میں تمام اہلِ محفل شریک تھے۔ مجھے یہ بات بہت پسند آئی کہ چکھنے کی حد سے کوئی آگے نہیں بڑھا۔

ایرا نے اقبال کی "گلشنِ رازِ جدید" کے ساتھ محمود شبستری کی "گلشنِ راز" کا ذکر چھیڑا اور کہنے لگی تصوف ایک بہت ہی مشکل موضوع ہے۔ میں نے حیرت سے کہا کہ آپ لوگ نہ خدا کو مانتے ہیں نہ روح کو۔ آپ تصوف کے مفہوم سے کیسے لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔ پریگارینا بولیں واقعی بعض مقامات بہت وقت طلب ہیں مثلاً اپنے اندر سفر کرنے کے مفہوم سے ہم لوگ ناآشنا ہیں۔ میں نے کہا یہ سوال "گلشنِ راز" میں بہت اہم سوال ہے۔ پھر میں نے محمود شبستری کا یہ شعر پڑھا

> کہ من باشم مرا از من خبر کن
> چہ معنی دارد اندر خود سفر کن

اور بتایا کہ پہلے مصرعے میں جو سوال ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ "خودی کی ماہیت کیا ہے" یا "میں" کسے کہتے ہیں اور دوسرے مصرعے میں جو سوال درج ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ "اپنے اندر سفر کرنے سے کیا مراد ہے؟" دراصل یہ دونوں مصرعے آپس میں انتہائی مربوط مصرعے ہیں اور ان دونوں مصرعوں میں دو سوال نہیں بلکہ ایک ہی سوال پوشیدہ ہے۔ خود محمود شبستری اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ جب ہستی مطلق قابلِ اشارہ ہو جاتی ہے یعنی جب انائے مطلق تعینات میں آکر متعین ہو جاتا ہے اور انائے مقید کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس انائے مقید کو "تمن" یا خودی کہتے ہیں۔ ساتھ ہی میں نے اپنی اس ناقص رائے کا اظہار کیا کہ ان دو سوالات کے جواب میں اقبال نے وحدۃ الوجود کا وہی تصور پیش کیا ہے جو خود محمود شبستری کا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے اشعار یہ ہیں

> ترا گفتم کہ ربطِ جان و تن چیست سفر در خود کن و بنگر کہ من چیست

سفر در خویش زادن بے اب و مام
ثریّا را گرفتن از لبِ بام

اور اگرچہ اقبال اس مسئلے کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اس راز کا زبان پر لانا مشکل ہے لیکن ساتھ ہی اپنا نظریہ ان لفظوں میں بیان کر بھی دیتے ہیں کہ

جدا از غیر و ہم وابستۂ غیر
گم اندر خویش و ہم پیوستۂ غیر

— — — — — — —

چراغے در میانِ سینۂ تست
چہ نور است ایں کہ در آئینۂ تست
مشو غافل کہ تو او را امینی
چہ نادانی کہ سوئے خود نہ بینی

یہ بالکل وہی خیال ہے جو ساقی نامہ میں ان الفاظ کا لباس پہن کر ہمارے سامنے آیا ہے

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں، بے نظیر
یہ عالم، یہ بت خانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں، سونے میں، پارے میں ہے

اس پر غالباً پریگارینا یا ایرا نے سوال کیا کہ اقبال جب یہ کہتے ہیں کہ

بطرزِ دیگر از مقصود گفتم
جواب نامۂ محمود گفتم

تو وہ بطرزِ دیگر سے کیا مراد لیتے ہیں۔

سوال واقعی بہت دلچسپ تھا اور بہت اہم اور یہ دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی کہ اقبال پر کام کرنے والے روسی طلبہ اور ان کے اساتذہ کس طرح اقبالیات کی گہرائی میں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہم بیشتر ہندستانیوں اور پاکستانیوں کی طرح کلامِ اقبال سے سرسری نہیں گزر جاتے بلکہ ہر جا "جہانِ دیگر" تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ چنانچہ میں نے اس مجمع عاشقانِ اقبال کے سامنے یہ بات وضاحت سے بیان کی کہ یہ اشارہ محمود شبستری کے تصورِ فنا فی اللہ کی طرف ہے۔ اقبال فنا فی اللہ سے جو مراد لیتے ہیں وہ مفہوم محمود شبستری کا نہیں ہے۔ انائے مقید کا کامل محو د شبستری اور شیخ محی الدین ابن عربی دونوں کے یہاں یہ ہے بلکہ رومی کے یہاں بھی یہی ہے کہ وہ انائے مطلق میں گم ہو جائے۔ اقبال اس وصال کے قائل نہیں بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ انائے مقید کی اپنی ہستی برقرار رہے۔ یہاں میں نے اقبال کے یہ شعر مثال کے طور پر پڑھے۔

اے خوش آں جوئے تنک مایہ کہ از ذوقِ خودی
در دلِ خاک فرو رفت و بدریا نہ رسید

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب
عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب
گرمیِ آرزو فراق، شورشِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرے کی آبرو فراق

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولیٰ
نگیرد با من ایں سودا بہا از بس گراں خواہی
تو فناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام سوختنِ ناتمام
بہ بحرش گم شدن انجامِ ما نیست
اگر او را تو در گیری فنا نیست
چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی
ترا او بیند و او را تو بینی

اس محفل میں اقبال کے فارسی اشعار نے اردو اشعار کی بہ نسبت زیادہ کام دیا کیوں کہ اگرچہ ہماری بات چیت زیادہ تر اردو ہی میں رہی لیکن پریگارینا 'نتاشا' ایرا اور مجا کی وجہ سے فارسی اشعار کا پلڑا اردو کے مقابلے میں بھاری رہا۔

اس بات چیت نے کافی طول کھینچا اور پوپاوا 'نینا' پریگارینا 'ایرا اور مجا بڑے غور سے میری باتیں سنتے رہے۔

اتنے میں پوپاوا نے کہا کہ آپ کھانا ہمارے یہاں کھائیں گے۔ اس وقت کھانا گرم ہے بعد میں ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میں کھانا میز پر لگاتی ہوں۔ یہ کہہ کے وہ اٹھیں۔ لیو نے ان کا ہاتھ بٹایا اور انھوں نے چاول اور روسی روٹی کے ساتھ طرح طرح کے کھانے میز پر چن دیے۔ میں نے پریگارینا سے کہا ابھی تو چھ بجے ہیں۔ کیا آپ رات کا کھانا اتنا جلد کھا لیتے ہیں۔ بولیں ہم لوگوں کے کھانے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی اور کھانے کی میز پر جا بیٹھا۔ پوپاوا نے کھانا بہت لذیذ پکایا تھا۔ مرغ، مچھلی، گوشت، ترکاری، چاول ہر چیز لذیذ تھی۔ مکھن، پنیر، سلاد اس کے علاوہ تھا۔ کھانے کے دوران میں روسی آداب کے مطابق ایک بار پھر واڈکا کا دور چلا۔ کوئی سات بجے کھانے سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد چائے آئی اور پھر ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر واپس آگئے۔ کھانے کے دوران میں بھی اردو زبان اور ادب کا ذکر چلتا رہا۔ اسی میں مشاعرے کا ذکر آیا اور پوپاوا نے مجھ سے کلام سنانے کی فرمائش کی لیکن یہ فرمائش ذکرِ اقبال ہی کی نذر ہو گئی۔

پریگارینا نے "بانگِ درا" کھول کے اقبال کی نظم "میں اور تو" نکالی اور پوچھا کہ کیا "تو" سے مراد "ہندو" ہے۔ میں نے نظم کے ایک ایک شعر کی تشریح کی اور بتایا کہ "تو" سے مراد "ہندو" نہیں ہے بلکہ اس "تو" سے مراد ایک مخاطب نہیں کئی مخاطب ہیں۔ بنیادی طور پر اس نظم میں اقبال نے اپنا فلسفۂ حرکت اور فلسفۂ ارتقاء بیان کیا ہے۔ یہ آپ کہہ سکتی ہیں کہ "تو" سے مراد Have ہے اور "میں" سے مراد Have not ہے لیکن Have Not بھی ہمیشہ have not نہیں رہے گا کیوں کہ تغیر اصولِ فطرت ہے۔ ایک ہی مقام پر قرار یا قیام نظریۂ ارتقاء کے خلاف ہے۔ اقبال حرف "کن" سے بھی یہی مراد لیتے ہیں ــــ کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون۔ یعنی یہ کائنات ہر لحظہ ارتقاء پذیر ہے۔ پریگارینا نے میری بات غور سے سننے کے بعد کہا کہ اسی عنوان کی ایک نظم اور بھی ہے۔ کیا وہاں "تو" سے مراد "ہندو" ہے۔ میں نے اس نظم کے دو تین شعر انھیں سنائے۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا

کہنے لگیں ہاں یہی نظم ہے۔ میں نے کہا "اس میں بھی تو سے مراد "ہندو" نہیں ہے بلکہ اس
نظم میں بحیثیت مجموعی خطاب مسلمانوں سے ہے۔ ان مسلمانوں سے جنھوں نے غیر اسلامی طریقے
اپنا لیے ہیں۔ میں نے اس نظم کے اکثر اشعار کا انھیں انگریزی میں ترجمہ کرکے سنایا، بالخصوص اس شعر کا

گلہ وفائے جفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
جو صنم کدے میں بیاں کروں تو صنم پکارے ہری ہری

اس پر نتاشا کہنے لگیں کہ ہاں اب بات سمجھ میں آگئی ہے۔ پہلے اس نظم کے متعلق میرا خیال کچھ اور تھا۔
معلوم نہیں بعض غیر ملکی طلبہ وطالبات کے دل میں یہ بات کیوں گھر کر گئی ہے کہ اقبال
کی ساری شاعری "ہندو" اور "مسلمان" کے دائروں میں محصور ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب
اقبال پر وہ بیسیوں کتابیں ہوں جن میں اقبال کو ایک بہت ہی محدود انداز میں پیش کیا
گیا ہے۔ جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے۔ اقبال اس وقت ایک دوراہے پر ہیں۔ اس حقیقت
کو کہ اقبال کا سرچشمۂ افکار بنیادی طور پر قرآن اور حدیث ہے اس طرح سے پیش کرنا کہ اقبال
"ہندو" اور "مسلمان" کے تنگ دائروں سے باہر نہیں نکل سکے، کلام اقبال اور فکر اقبال کے انتہائی
بے احتیاط اور غیر ذمہ دارانہ مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اقبال کو اس طرح محدود کر دینے سے اقبال اور
اسلام دونوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔

اس کے بعد پریگارینا نے "خضر راہ" کا ذکر چھیڑا اور کہا کہ سردار جعفری کہتے ہیں "آفتاب
تازہ" سے مراد "سوشلزم" ہے آپ کا کیا خیال ہے۔ میں نے کہا میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔
"خضر راہ" کا یہ سارا بند

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

سرمایہ و محنت کی آویزش کے متعلق ہے۔ پریگارینا کہنے لگیں میرا خیال ہے "آفتاب تازہ"
سے مراد "اسلام" ہے۔ میں نے اس بند کے بعض اور اشعار سنا کر اپنا نقطۂ نگاہ واضح کرنے
کی کوشش کی لیکن نتاشا مجھ سے متفق نہ ہوئیں۔ اقبال کے سوشلزم سے متعلق خیالات پر
ذرا سی بات ہوئی اور میں نے کہا کہ اس موضوع پر میں نے اپنی کتاب "اقبال اور مغربی
مفکرین" میں مفصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب نتاشا کے پاس تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں کتاب
کے متعلقہ حصے کو پوری توجہ سے پڑھوں گی۔

نتاشا کو میں نے بتایا کہ آپ کا پتا مجھے ڈاکٹر شکیل الرحمن نے دیا تھا۔ بولیں ڈاکٹر
شکیل الرحمن میرے گھر بھی آچکے ہیں۔ میری دو بیٹیاں ہیں۔ ایک بارہ سال کی۔ دوسری
آٹھ سال کی۔ بارہ کو انھوں نے انگریزی میں Twenty کہا۔ ایرا نے ان کی تصحیح
کی اور کہا Twelve
کہنے لگیں ڈاکٹر شکیل الرحمن نے میری بڑی بچی کو دیکھ کر کہا یہ
ہندستانی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے کہا مجھے تو اس وقت آپ سب ہندستانی معلوم ہو رہے
ہیں۔ اردو میں ہم لوگ بات کر رہے ہیں اقبال اور اردو کے دوسرے فن کاروں کا ذکر ہو رہا
ہے۔ یہ تو سارا ماحول ہی ہندستانی ہے۔

گھڑی دیکھی تو نو بج چکے تھے۔ میں نے اجازت طلب کی۔ یو پا، پریگارینا، ایرا

اور فیا مجھے "یونی ورسٹی" نام کے زمین دوز اسٹیشن تک پہنچانے آئے۔ وہاں سب سے
الوداع کہی۔ میں اور الیگزینڈر بجلی کے زینے سے نیچے اترے اور ایک عمل نما ریلوے اسٹیشن
پر جا پہنچے۔ فیا بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ریلیں ایک ایک منٹ کے بعد آ جا رہی تھیں۔ ایک
ڈیڑھ منٹ میں ہم ریل میں سوار ہو گئے زمین دوز ریلیں بہت تیز چلتی رہیں۔ تھوڑی دیر
میں ہم "مارکس" نامی اسٹیشن پر اترے۔ بجلی کا زینہ ہمیں چشم زدن میں باہر زمین پر لے
آیا۔ وہاں سے کریملن کے سامنے ریڈ اسکوائر اور لینن کے مقبرے سے ہوتے ہوئے ہم لوگ اپنے
ہوٹل پہنچ گئے۔

الیگزینڈر مجھے کمرے میں پہنچا کے رخصت ہوئے اور میں کپڑے تبدیل کر کے سو گیا۔ دن میں
چوں کہ بھاگم بھاگ رہتی ہے اور میں بہت تھک جاتا ہوں اس لیے رات کو نیند بڑے
مزے کی آتی ہے۔ ہاں ایک دن چائے کی زیادتی کے باعث صبح تک جاگنا پڑا تھا۔ اس کے
بعد میں چائے اور کافی کے معاملے میں محتاط ہو گیا۔

▲

پروفیسر آزاد، مشہور لیتھوین اہل قلم
وکٹر الویولیس کے ساتھ (۱۲ ستمبر ۱۹۸۶ء)

۹

ریگا کو روانگی

اگلے دن اتوار تھا۔ میں نے سوچا کہ اتوار کو ملاقاتیں وغیرہ چونکہ نہیں ہوں گی اس لیے دریا کے ذریعے سے ماسکو کی سیر کا پروگرام بنائیں گے لیکن الیگزینڈر نے کہا کہ آج بھیڑ زیادہ ہوگی اس لیے اسٹیمر کا ٹکٹ شاید نہ مل سکے۔ الیگزینڈر پچھلے دن سے میرے ساتھ صبح سے شام تک دوڑ دھوپ میں مصروف تھے۔ میں نے سوچا آج اتوار کو انھیں کچھ وقت اپنے گھر والوں کو دینا چاہیے اس لیے ان سے کہا کہ آپ اتوار کو آرام کریں اور شام کو ریل کی روانگی سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے آجائیں۔ سفر کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ فرسٹ کلاس کے کوپے میں ہم دونوں کی بکنگ ہو گئی ہے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہ رخصت ہوئے۔

اتوار کو میں نے بھی ایک طرح سے چھٹی منائی۔ اکثر دوستوں کو ٹیلی فون کیا لیکن گھر پر کوئی نہ ملا۔ ڈاکٹر گاندھی مل گئے۔ انھوں نے ریگا اور لینن گراڈ کے سفر کے متعلق گراں قدر مشورے دیے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کل یا پرسوں کی ڈاک میں ایک خط میرے نام آیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ رام لعل یا ہرچرن چاولہ کا ہوگا۔ لیکن اب خط منگوانے کا وقت نہیں تھا۔ ناروے سوچا لینن گراڈ سے واپسی پر لے لوں گا۔

میں نے ناشتے کے بعد "ماسکو نیوز" کے لیے اپنا مقالہ مکمل کیا۔ اسے صاف کیا۔ سری نگر اور لکھنؤ خطوط لکھے اور سفر کے کچھ نوٹس تیار کیے۔ اس کام سے فارغ ہوا تو رختِ سفر باندھا۔ اب کرنے کو کچھ نہ تھا۔ ابھی چار بجے کا وقت تھا اور الیگزینڈر کو سات بجے آنا تھا۔ سوچا تھوڑی دیر تنہا ماسکو کی سیر کی جائے چنانچہ نیچے اترا اور دریائے ماسکو کے کنارے کنارے چلا۔ ایک طرف کریملن کی دیوار تھی۔ دوسری طرف دریائے ماسکو جس میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اسٹیمر آجا رہے تھے۔ کریملن کی دیوار اور میرے فٹ پاتھ کے درمیان ٹریفک چل رہا تھا۔ سارا منظر بہت دل فریب تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی اور ماسکو دمک رہا تھا۔ دریا کے کنارے اکثر لوگ مچھلیاں پکڑتے نظر آئے۔ غالباً یہاں مچھلیاں پکڑنے پر کوئی پابندی نہیں ہے یا ممکن ہے سب نے لائسنس لے رکھے ہوں۔ بوس و کنار کے مناظر بھی نظر آئے ہیں کوئی

ایک گھنٹے تک دریا کے کنارے چلتا گیا۔ جب تھک گیا تو واپس لوٹا اور ہوٹل میں پہنچ کے الیگزینڈر کا انتظار کرنے لگا۔ ساڑھے سات کے قریب الیگزینڈر آگئے۔ وہ انٹورسٹ کی گاڑی اپنے ساتھ لائے تھے۔ دس پندرہ منٹ میں ہم لوگ اسٹیشن پہنچ گئے اور ماسکو ریگا میل میں اپنے کوپے میں داخل ہوئے۔

یہاں کی ریل گاڑیاں ہمارے ہندستان کی ریل گاڑیوں سے قدرے مختلف ہیں۔ فرسٹ کلاس کے کوپے میں دونوں برتھوں پر بستر لگے تھے نیچے کی برتھ کے ساتھ ایک میز رکھی تھی اور میز کے ساتھ ہی ایک آرام دہ کرسی۔ میز پر گلدان کے علاوہ لکھنے پڑھنے کے لیے لیمپ بھی تھا۔ بسکٹ کا پیکٹ شکر کے کیوب اور ایش ٹرے بھی رکھی تھی۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ کمرے میں ریڈیو لگا تھا جس پر ہمیں روانگی سے قبل یہ بتایا گیا کہ ریل اب ریگا کو روانہ ہونے ہی والی ہے۔ باقی وقت اس ریڈیو پر مدھم سروں میں دلکش موسیقی چلتی رہی۔ ہم لوگ سونے لگے تو ریڈیو ہم نے بند کر دیا۔

ساتھ ہی ملحقہ ایک چھوٹا سا ہاتھ منہ دھونے اور شیو بنانے کے لیے غسل خانے کی طرح کا ایک کمرہ تھا۔ لیوٹیری باہر کوری ڈور میں تھی یہ Vestibule گاڑی تھی۔ کھانا کھانے کے لیے ہم ریسٹورنٹ میں گئے۔ ڈنر صرف روٹی اور آلو گوشت پر مشتمل تھا۔ ہندستانی طریقے پکا ہوا تھا۔ مزے سے کھایا۔ مشروبات میں شراب اور لیمونیڈ تھا۔ میں نے اور الیگزینڈر نے لیمونیڈ پیا۔ بہت مفرح تھا۔

صبح کو جاگا تو ریل کسی اسٹیشن پر رکنے والی تھی۔ لیوٹیری کا دروازہ بند پایا۔ کنڈکٹر گارڈ نے جو ایک خاتون تھی بتایا کہ چوں کہ اسٹیشن قریب ہے۔ اس لیے لیوٹیری کا دروازہ میں نے بند کر دیا ہے۔ ریل چلے گی تو کھول دوں گی۔ ریل اسٹیشن پر تھوڑی دیر رک کے چل دی۔ کنڈکٹر گارڈ نے لیوٹیری کا دروازہ کھول دیا۔

الیگزینڈر ابھی سو ہی رہا تھا کہ میں نے اپنے کمرے میں آکے ہاتھ منہ دھویا اور تیار ہو گیا۔ کنڈکٹر گارڈ کافی کا گرم بھبکتا ہوا پیالہ لے آئیں۔ الیگزینڈر کی بیوی نے میرے لیے ایک بہت عمدہ کیک بھیجا تھا اور ساتھ ہی بسکٹ بھی۔ اتنے میں الیگزینڈر جاگ گیا۔ بولا چلیے ریسٹورنٹ میں جاکے ناشتہ کریں۔ ریسٹورنٹ دور تھا۔ میں نے کہا کیک اور بسکٹ موجود ہیں۔ کافی بھی ہے۔ یہیں ناشتہ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ناشتے کے ساتھ ہی ساتھ میں مناظر سے بھی لطف اندوز ہونے لگا۔

غالباً ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ لیڈی کنڈکٹر گارڈ جب صبح میرے ساتھ کچھ اشاروں سے اور کچھ زبان سے باتیں کر رہی تھی تو پہلا کام اس نے یہ کیا کہ کمپارٹمنٹ کے دروازے کے باہر لگے ہوئے ہینڈلوں کو صاف کیا جو بارش میں بھیگ گئے تھے۔ اس لیے کہ ایک خانساماں ناشتے کا سامان لیے اس میں سوار ہونے والا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میری نظر یک سوئی کے ساتھ کھڑکی سے باہر مناظر پر جم گئی میلوں

تک پھیلے ہوئے سبزہ زار اور اشجار کشمیر کا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ کشمیر میں اگر ریل بن جائے تو ریل کی کھڑکی سے اسی طرح رواں دواں مناظر نظر آئیں گے اور پہاڑوں کے مناظر اس پر مستزاد۔ ماسکو میں پہاڑ نہیں ہیں صرف سبزہ زار اور دریا ہیں۔ کشمیر میں پہاڑوں کے حسن نے جو بات پیدا کر رکھی ہے وہ اپنی جگہ ماورائے تعریف ہے۔

ریگا تک پہنچنے میں کوئی آدھ گھنٹہ باقی تھا کہ سبزہ زار سے سو پچاس گز پرے اشجار کا ایک جھنڈ نظر آیا جیسے گلمرگ میں نظر آتا ہے۔ یہ جھنڈ ختم ہوا تو ایک دریا نظر آیا ریل کی پٹری کے متوازی لیکن جلد ہی یہ منظر نظر سے اوجھل ہو گیا کیوں کہ یا تو دریا نے رخ بدل لیا تھا یا ریل نے۔ پھر ایک سڑک ریل کی پٹری کے متوازی چلنے لگی۔ لیکن یہ نظارہ بھی جلد ختم ہو گیا اور کھیتوں میں بنے ہوئے خوب صورت مکان نظر آنے لگے۔ غالباً کوئی چھوٹا سا خوب صورت گاؤں تھا۔ اس کے بعد پھر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سب اتنی تیزی سے گزر رہے تھے کہ کسی ایک منظر پر نظر کا جمنا محال تھا۔ مجھے اس وقت اپنی ایک پرانی رباعی یاد آئی

اے منظرِ بے قرار دم بھر تو ٹھہر — اے جلوۂ زرنگار دم بھر تو ٹھہر
جی بھر کے میں اک بار تجھے دیکھ تو لوں — اے قافلۂ بہار دم بھر تو ٹھہر

پروفیسر آزاد مشہور لیٹوین شاعر یانس رائنس کی ایک سو تیرہویں سالگرہ کی تقریب میں تقریر کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ صدر شعبۂ انگریزی ریگا یونی ورسٹی سگما انکرواوا ہیں جو ساتھ ہی ساتھ پروفیسر آزاد کی تقریر کا لیٹوین میں ترجمہ کر رہی ہیں۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۸ء

(۱۰)

لیٹویا کی ایک جھلک

اتنے میں الیگزینڈر نے بتایا کہ ریگا آنے والا ہے۔ میں نے اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹا، اسے بیگ میں رکھا اور تیار ہو کے بیٹھ گیا۔

ریگا تک پہنچتے پہنچتے بارش ختم ہو چکی تھی۔ بادل بھی چھٹ رہے تھے اور ان میں سے ہلکی ہلکی دھوپ چھن چھن کر مرغزاروں کو لباسِ نور پہنا رہی تھی۔ دھوپ ذرا تیز ہوئی تو سبزہ زار اور ہرے بھرے کھیت زمرد کی طرح چمکنے لگے۔ میں اس طلسماتی فضا میں گم تھا کہ ریل ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور میرا یہ طلسماتی عالم ریزہ ریزہ ہو گیا۔

ریل سے اترے تو پھر بوندا باندی شروع تھی۔ پلیٹ فارم پر سوویٹ رائٹرس یونین کے دو نمایندے اناتا اور اندرس موجود تھے۔ اناتا انگریزی نہیں جانتی تھیں۔ اندرس انگریزی سے آشنا تھے۔ باہر نکل کے سوویٹ رائٹرز یونین کی گاڑی میں بیٹھے اور کوئی دو چار منٹ میں اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ اس کا نام ہے ریگا ہوٹل۔ الیگزینڈر کا کمرہ مجھ سے ایک کمرہ چھوڑ کے تھا۔ میرا تھا دو سو اڑتیس اُن کا دو سو چھتیس۔ یہ کمرے دوسری منزل پر تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کمرے کا جائزہ لیا۔ ریڈیو، ٹیلی فون، باتھ روم سب رسیا ہوٹل کی طرح تھے۔ یہاں میں ٹیلی ویژن اور ریفریجریٹر نہیں تھے۔ کمرہ بہت خوب صورت اور آرام دہ تھا۔ سامنے دروازہ تھا اس میں سے دیکھا تو نیچے نہایت ہی خوبصورت لان نظر آئے۔ سرخ پھولوں کے تختے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ہوٹل کی حدود کے باہر اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ ان کے پیچھے ایک کلیسا کا گنبد اپنے ماضی کی داستانِ عظمت سنا رہا تھا۔ غالباً یہ میں بتانا بھول گیا ہوں کہ خدا کو نہ ماننے والا روس چرچوں اور عبادت گاہوں سے معمور ہے۔ ماسکو میں میرے کمرے کے قریب عین نیچے ایک چرچ تھا۔ ہوٹل سے باہر نکلتے ہی ایک چرچ سے سابقہ پڑتا تھا۔ ریل ریگا میں داخل ہونے لگی تو پہلے سب سے بڑی عمارت جس پر نظر پڑی ایک چرچ ہی کی تھی۔ کریملن میں بھی چرچوں اور کیتھیڈرلوں کی کمی نہیں تھی۔ اور تو اور لینن کے مقبرے کو جاتے ہوئے بھی ایک چرچ کے پاس سے ہو کے جانا پڑتا تھا۔ بقولِ جگر مراد آبادی ؎

سوچا تھا تجھ سے دور نکل جائیں گے کہیں
دیکھا تو ہر مقام تری رہگذر میں ہے

ریلوے اسٹیشن سے ہوٹل آتے ہوئے رستے میں انا نے بتایا کہ یانس رائنس لیٹویا کے ایک بڑے شاعر گزرے ہیں اور آج سے پانچ دن تک ان کی ایک سو تیرھویں سال گرہ منائی جا رہی ہے۔ انھوں نے مجھے صدی تقاریب میں شرکت کی دعوت دی اور کہا کہ میں خود یا رگما ڈیڑھ بجے آپ کو لینے کے لیے آئیں گی۔ رگما سے میرا غائبانہ تعارف ماسکو میں نتاشا کے ذریعے سے ہو چکا تھا اور میں ان سے ملنے کا مشتاق تھا۔ ہوٹل پہنچ کے انا نے میرے پاسپورٹ اور ویزا کے اندراجات کرائے اور وہ اور اندرس اجازت طلب ہوئے۔

ابھی ڈیڑھ بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ناشتہ چوں کہ ہم ریل میں کر چکے تھے اس لیے سوچا ہوٹل کے قریب ذرا سیر کی جائے۔ نیچے اترے تو سامنے ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور تھا۔ وہاں سے کچھ سگار خریدے اور ماچس۔ اس کی ہر منزل پر جا کر سیر کی۔ یہ یورپ کے بڑے بڑے اسٹوروں کی طرح ایک عجائب خانہ تھا۔ میرا تو اس عجائب خانے سے باہر آنے کو جی نہ چاہتا تھا لیکن ڈیڑھ بجنے کو تھا اس لیے واپس ہوٹل آ گئے۔

ابھی کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے (Come in) کہا۔ دروازہ کھلا اور کمرہ جیسے کہ فرش سے چھت تک بقعۂ نور بن گیا۔ یہ رگما تھی چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ میں اُسے دیکھنے کا دیکھتا رہ گیا۔ اس نے مجھے انگریزی میں خوش آمدید کہا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں اس کا حسن و جمال دیکھ کے دنگ تھا۔ بولی یانس رائنس کے مجسمے کے سامنے پارک میں جلسہ شروع ہونے والا ہے۔ لیٹویا کے تمام شعرا، افسانہ نگار، ڈراما نگار اور ادبا آ چکے ہیں۔ یونی ورسٹی کے پروفیسر اور دوسرے اساتذہ بھی۔ میں آپ کو لینے آئی ہوں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہوٹل سے باہر نکلے ہی تھے کہ موسلادھار بارش نے گھیر لیا۔ جلسہ چار ہی قدم پر ہو رہا تھا۔ ہجوم نظر آ رہا تھا۔ ہوٹل کی حدود کے ختم ہوتے ہی پارک شروع ہو رہا تھا اور پارک میں گاڑیوں کے لیے سڑک ہی نہیں تھی اس لیے رگما بغیر گاڑی ہی کے آ گئی تھی۔ رگما نے اپنی چھتری کھول لی۔ الیگزینڈر نے اپنی چھتری کھول کے میرے اوپر کر دی لیکن بارش چوں کہ تیز تھی اس لیے رگما نے کہا کہ ذرا دیر اس گھنے پیڑ کے نیچے رک جاتے ہیں۔ مجھے اور الیگزینڈر کو اس درخت کے نیچے چھوڑ کے وہ شاید میرے لیے چھتری لینے گئی لیکن بارش دو منٹ میں رک گئی اور وہ اُنھی قدموں واپس آ کے مجھے جلسہ گاہ تک لے گئی۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے میرا ایک لیٹوین شاعرہ اور سوویٹ رائٹرز یونین کی ریگا برانچ کی سکریٹری ڈائنا آودوتینا سے تعارف کرایا۔ میں نے دیکھا کہ یانس رائنس کے نہایت اونچے مجسمے کے سامنے بیس پچیس مرد اور عورتیں ایک قطار باندھے سامعین کی طرف رخ کیے کھڑے ہیں۔ پتا چلا کہ یہ لیٹویا کے نامور شاعر اور ادیب ہیں۔ ڈائنا آودوتینا اور رگما مجھے اسی جماعت میں لے گئیں۔ یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ رائٹرز یونین کی طرف سے لیٹویا رائٹرز یونین کو میرے آنے کی اطلاع پہلے سے مل چکی تھی۔ تمام

ادیبوں نے آ کے ہاتھ ملایا۔ رگما سب کے ساتھ میرا تعارف کرا رہی تھی۔

اب جلسہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے سوویٹ رائٹرز یونین کی ریگا برانچ کی سکریٹری ڈائنا آودوتینا نے افتتاحیہ اور استقبالیہ تقریر کی اور اس میں کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ آج ہندستان اور پولینڈ سے دو مہمان شاعر ہمارے یہاں موجود ہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی ٹیلی وژن کے کیمروں اور دوسرے کیمروں کا رخ میری طرف اور پولینڈ کی شاعرہ کی طرف ہو گیا اور دیر تک یہ کیمرے چلتے رہے۔ یہ تقریر ختم ہوئی تو کورس میں ایک گانا شروع ہوا۔ کوئی تیس کے قریب لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک جماعت یہ گانا گا رہی تھی۔ دراصل یہ یانس رائنس کی ایک نظم تھی جس کا مفہوم یہ تھا

نیا زمانہ آ رہا ہے
نیا زمانہ یقیناً آئے گا اسے تو آنا ہی ہے لیکن وہ
خود بخود نہیں آئے گا
اس کو لانے کے لیے ہم سب کو بہت کچھ
کرنا ہوگا

اس کے بعد ایک اور نظم موسیقی کے انداز میں سنائی گئی۔ یہ نظم لیٹویا کے مقبول ترین جدید شاعر ایمنرزی دورنیس کی تخلیق تھی۔ اس کی دھن ایمنرس کالنش نے بنائی تھی اور ایک مشہور میوزک ڈائرکٹر ڈائمنڈ گالس کی زیر ہدایت یہ کورس تیار کیا گیا تھا۔ یہ نظم لینن کی شان میں تھی۔

اب ایمنرزی دورنیس مائک پر آئے۔ ان کی نظم کا مفہوم یہ تھا

جب تم پر کاہلی طاری ہو اور تم
کوئی کام نہ کرنا چاہتے ہو
تو اپنے آپ سے پوچھو کہ اگر میں یہ نہ کروں گا
تو اور کون کرے گا
اور اگر اب میں یہ نہ کروں گا تو کب کروں گا

یہ نظم ختم ہوئی تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔

شاعرہ مارز لیسے کی نظم ابھرتے ہوئے سورج کے موضوع پر تھی۔ آلگا لیسا وسکا نے اپنی نظم میں کہا:

انسان کا انسان کے ساتھ ایک گہرا رشتہ ہے
ایک فرد کے شروع کیے ہوئے کام کو کبھی
ختم نہیں ہونا چاہیے
دوسروں کو چاہیے کہ جہاں وہ کام رکنے لگے
اسے ہاتھ میں لے لیں
تاکہ یہ ایک مسلسل زنجیر بنتی چلی جائے

ان تمام نظموں کے ترجمے بیگما مجھے انگریزی میں سناتی رہیں۔ بیگما نے بتایا کہ آنگا لیساویسکا نے سروجنی نائیڈو کی متعدد نظموں کا ترجمہ لیتھونین میں کیا ہے۔ یہ تمام ترجمے ایک کتاب کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں جس کا تعارف بیگما نے لکھا ہے۔ خود بیگما نے سروجنی نائیڈو پر ڈاکٹریٹ کی ہے۔

اسی طرح لینن گراڈ کی ایک شاعرہ آئیں۔ پھر پولینڈ کی مذکورہ شاعرہ۔ اور پھر کورس گانا۔ آخر میں ڈائمنا آودو تینیا نے میرا تعارف کرایا اور مجھ سے مائک پر آ کے تقریر کرنے کی فرمائش کی۔ میں ان کے چار، پانچ فقروں کے تعارف میں صرف چند الفاظ ہی سمجھ پایا۔ جگن ناتھ آزاد، جموں یونیورسٹی اور اقبال۔ دراصل میرے جلسہ گاہ میں پہنچتے ہی بیگما نے مجھ سے کہا تھا کہ پروگرام کے مطابق آپ کو ایک نظم پڑھنا ہے۔ کسی بھی موضوع پر۔ جو آپ اس کا انگریزی میں ترجمہ کریں گے اور میں لیتھونین میں۔ میں نے کہا ہوٹل سے چلتے وقت تم نے یہ بات نہ کہی۔ نظموں کی بیاض تو میں کمرے ہی پر چھوڑ آیا ہوں اور جلدی میں زبانی کوئی نظم یاد نہیں آئے گی۔ انھوں نے یہ بات ڈائمنا آودو تینیا تک پہنچائی۔ چنانچہ انھوں نے مجھ سے تقریر کی فرمائش کی۔

میں نے پہلے تین چار منٹ اردو میں تقریر کی اس کے بعد اسے انگریزی میں پھیلا کے دس بارہ منٹ تک لے گیا۔ انگریزی تقریر کا بیگما ساتھ ہی ساتھ لیتھونین میں ترجمہ کرتی جا رہی تھیں۔ ساری تقریر ٹیلی ویژن اور ریڈیو نے ریکارڈ کی۔ متعدد فوٹوگرافروں نے STILL کیمرے سے تصویریں لیں۔ تقریر ختم ہوئی تو تالیوں کا سلسلہ دیر تک چلا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ لیتھویا میں اہل ہندستان کی اتنی پذیرائی ہوگی۔ بعد میں اس صورت حال پر کہ ہندستان کی لیتھویا میں مقبولیت کا کیا سبب ہے بیگما نے روشنی ڈالی۔ اس موضوع پر میں بعد میں بات کروں گا۔

میں جب تقریر کر کے اپنی جگہ پر آیا تو سامنے کے ہجوم میں سے دو بچے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا پھولوں سے لدی دو ڈالیاں لے کے میرے پاس آئے اور انھوں نے وہ مجھے دے دیں۔ بچے خود پھولوں کی طرح تھے اور جب انھوں نے مجھے پھول پیش کیے تو میرا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ میں نے انھیں پیار کیا اور وہ پھول ہانس رائنس کے مجسمے پر چڑھا دیے۔ بچے بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد متعدد بچوں نے اپنے اپنے پھول لا کے مجھے دیے اور میں نے وہ تمام پھول ہانس رائنس کے مجسمے پر چڑھائے۔ اس کے بعد میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب لڑکوں، لڑکیوں، مردوں، عورتوں کا ایک ہجوم ہاتھوں میں قلم لیے، ہانس رائنس کے مجموعۂ کلام کا پہلا ورق نکال کے میرے سامنے آ گیا۔ بیگما نے بتایا کہ یہ آپ کے آٹوگراف لینا چاہتے ہیں۔ آٹوگراف لینے والوں کی تعداد سو سے کم کیا ہوگی۔ میں نے ان سب کو اردو اور انگریزی میں آٹوگراف دیے۔ بعض لڑکیاں ایک خاص قسم کے ریشمی رومال لائیں اور ان پر آٹوگراف دینے کو کہا۔ رومال پر لکھنا مشکل تھا لیکن یہ منزل بھی طے ہو گئی۔ ٹیلی ویژن یہ تمام مناظر فلماتا رہا۔ ایک فوٹوگرافر نے کہا کہ میں نے آپ کی بے شمار رنگین تصویریں لی ہیں۔ یہ میں آپ کو ہندستان بھیجنا چاہتا ہوں۔ میری

خواہش ہے کہ آپ ان پر آٹوگراف کر کے یہ مجھے واپس بھیج دیں۔ بیگما نے مداخلت کی اور کہا کہ ایک ایک تصویر آزاد کے لیے الگ سے بھیجیے تب آٹوگراف کی ہوئی تصویریں آپ کو ملیں گی۔ اس نے یہ شرط بلا تامل قبول کر لی اور میرا پتا مجھ سے لے لیا۔

جلسے کے خاتمے پر پروفیسر ڈاکٹر اوبولیس سے ملاقات ہوئی۔ بیگما نے بتایا کہ انھوں نے ڈاکٹریٹ کا تھیسس رابندر ناتھ ٹیگور پر لکھا ہے اور ٹیگور پر لیتھونین میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ان کی بیوی ملک گیر شہرت کی بت تراش ہیں اور انھوں نے ٹیگور کا ایک مجسمہ بنایا ہے۔ بیگما کی یہ بات میرے لیے بالکل نئی تھی اور بڑی حد تک حیرت کا باعث کہ ٹیگور کی تمام کتابیں لیتھونین زبان میں ملتی ہیں۔ اس وقت تک ٹیگور کے ترجمے یورپ کی آٹھ زبانوں میں ہو چکے ہیں اور لیتھونین ان میں سے ایک ہے۔

پروفیسر اوبولیس نے بتایا کہ وہ ایک ہفتے تک شانتی نکیتن جا رہے ہیں تاکہ ڈاکٹریٹ کی دوسری ڈگری کے لیے مواد جمع کر سکیں۔ غالباً دوسری ڈگری سے ان کی مراد ڈی لٹ تھی۔

آٹوگراف کا سلسلہ ختم ہوتے ہی پروفیسر اوبولیس، بیگما، الیگزینڈر اور میں ہوٹل کو روانہ ہوئے۔ اس وقت تین بج چکے تھے۔ ہوٹل دو ایک قدم پر تھا۔ دروازے پر پہنچے تو پروفیسر اوبولیس نے کہا کہ میں شام کو چھ بجے آؤں گا اور آپ کو ایک نمائش میں لے جاؤں گا۔ الیگزینڈر نے کہا کہ میری والدہ یہاں قریب ہی سمندر کے کنارے رہتی ہیں۔ ریل سے آدھ گھنٹے کا رستہ ہے۔ میں ان سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ چھ بجے تک میں بھی آ جاؤں گا۔ یہ کہہ کے دونوں اجازت طلب ہوئے۔ بیگما نے ان سے کہا کہ آپ اطمینان سے جائیے میں آزاد کے ساتھ رہوں گی۔ اوپر آئے تو میں نے کہا کہ پہلے چل کے کھانا کھا لیں۔ بھوک لگ رہی ہے۔ بیگما نے کہا کھانا میں نے بھی نہیں کھایا۔ چنانچہ ہم نے ریسٹورنٹ کا رخ کیا لیکن ریسٹورنٹ بند تھا۔ باہر لکھا تھا تین سے چار بجے تک بند رہے گا۔ اب چار بجے تک انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دونوں کمرے میں واپس آ گئے۔

میں نے کہا بیگما تم سے خوب ملاقات ہوئی۔ میں تم سے ملنے کا مشتاق تھا۔ اگر تم نہ آتیں تو میں تم کو ڈھونڈ نکالتا۔ بولی آپ کو میرا نام کہاں سے معلوم ہوا۔ میں نے کہا نتاشا نے تمہارا نام، پتا اور ٹیلی فون نمبر دیا تھا۔ کہنے لگی جی ہاں میں نتاشا اور جیلی شیو دونوں کی شاگرد ہوں۔ بیگما ٹوٹی پھوٹی ہندستانی میں بھی بات کر لیتی تھی جو اس کے منہ سے بہت بھلی معلوم ہوتی تھی لیکن اس میں چونکہ اسے دقت ہوتی تھی اس لیے ہماری بات چیت انگریزی ہی میں ہوتی رہی۔

۱۱

لیٹویا اور ہندستان

میں نے پوچھا "بگما، تم نے جلسہ گاہ میں کہا تھا کہ لیٹویا میں ہندستان کی مقبولیت کا سبب میں آپ کو بتاؤں گی۔ اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ آج میری اتنی زیادہ پذیرائی کیوں ہوئی۔"

اب بگما کی گل افشانیِ گفتار شروع ہوئی۔ اس نے لیٹویا کی تاریخ گیارھویں صدی سے شروع کی جب لیٹویا مختلف قبیلوں سے آباد تھا اور اس سے پہلے کے دور پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ قبائلی دور سے پہلے لیٹویا کا ہندستان کے ساتھ ایک روحانی اور مذہبی تعلق رہا ہے۔ ہندستانی دھرم یعنی ویدک دھرم (ویدک دھرم کا لفظ خود بگما نے استعمال کیا) سے لیٹویا صرف متاثر ہی نہیں تھا بلکہ یہاں اس دھرم کا پوری طرح عمل دخل تھا۔ یہاں کے دیوتا ویدک دھرم ہی کے دیوتا تھے یا ان کے بدیل تھے۔ کسی Perkons دیوی کا ذکر کرتے ہوئے بگما نے بتایا یہ وہی دیوی ہے جسے ویدک دھرم میں اندرا کہا گیا ہے۔ اسی طرح سے اور متعدد دیوی دیوتاؤں کے نام اس نے گن سنائے۔ لکشمی دیوی اور لکشمی تیوہار کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ یہ تیوہار لیگوا تیوہار کے نام سے آج بھی لیٹویا میں منایا جاتا ہے۔ یہ تیوہار ہر سال ہم اپنی ترقی، خوش حالی اور مسرت کے لیے ۲۳ جون کو مناتے ہیں۔ شام کو ہم آگ جلاتے ہیں یہ آگ ہَون ہی کی ایک صورت ہے اور یہ صبح تک جلتی رہتی ہے۔ اس دن ہم اپنا قومی لباس پہنتے ہیں۔ ہلکی شراب پیتے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے وید میں سوم رس کہا گیا ہے اور پنیر کھاتے ہیں۔

میں یہ سب سن کے غرقِ حیرت تھا اور بگما کہہ رہی تھی کہ ہم بھی ہندوؤں کی طرح اپنے گزرے ہوئے اجداد کو یاد کرتے ہیں۔ ان کے لیے کھانا تیار کر کے میزوں پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے پس منظر میں خیال یہی کارفرما ہے کہ یہ کھانا ان تک پہنچ جاتا ہے۔ اسے آپ لوگ شرادھ کہتے ہیں۔ یہ شرادھ ہم نومبر کے مہینے میں کرتے ہیں اور میں تو سُنیتی کمار چیٹرجی کی اس بات سے متفق ہوں کہ آریہ یہیں سے — لیٹویا ہی سے — ہندستان، ایران اور وسطِ

ایشیا میں گئے۔

ہمارے لوک گیتوں میں ایک گیت ہے ڈائنا جس میں چار مصرعے ہوتے ہیں یہ دراصل سنسکرت کا دھا تنا ہے۔ دھا تنا بھی چار مصرعوں ہی پر مشتمل ہوتا ہے اور ڈائنا اسی پر مبنی ہے۔

میں نے اعتراف کیا کہ میرے لیے یہ سب باتیں نئی ہیں تو ریگما نے پوچھا آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟ میں نے کہا یہ تم نے بہت مشکل سوال کیا ہے۔ ہمارے یہاں ہندستان میں ہندو یا مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہندو دھرم یا اسلام کے اصولوں پر عمل کرتا ہو۔ محض ہندو گھرانے میں پیدا ہونے سے یا مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے سے نہ ہندو ہونے کا دعوا کیا جا سکتا ہے نہ مسلمان ہونے کا۔ ویسے جو ہندوؤں کے گھر میں پیدا ہوتا ہے وہ ہندو کہلاتا ہے اور جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوتا ہے وہ مسلمان کہلاتا ہے۔ عمل کے اعتبار سے تمھیں ہندستان میں بہت کم ہندو اور بہت کم مسلمان ملیں گے۔ اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر عمل کرنے کے علاوہ مذہب سے نزدیک ہونے کی ایک اور بھی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی مذہب کے متعلق اپنے کتابی علم میں اضافہ کیا جائے اور اس معیار کو اگر سامنے رکھا جائے تو ہندو دھرم کے مقابلے میں میرا مطالعہ اسلام کے متعلق کہیں زیادہ ہے۔ ہندو گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود ہندو دھرم کا مطالعہ میرا بہت کم ہے۔ نہ ہونے کے برابر ہے۔ میرے لیے تمھارا مطالعہ ہندو دھرم کا باعثِ حیرت اور باعثِ رشک ہے لیکن یہ سب اپنے ماحول اور افتادِ مزاج کی بات ہے ریگما کہنے لگی کہ لیٹویا کا ہندو دھرم سے ایک خاص تعلق ہے۔ ریگا میں اکثر لوگ آج کل سنسکرت پڑھ رہے ہیں لتھوانیا میں یہ تعلق آپ کو اور زیادہ گہرا نظر آئے گا۔ لتھوانیا کی زبان اور سنسکرت ایک دوسرے سے اسی طرح ملتی ہیں جس طرح اردو اور ہندی۔ یہی سبب ہے کہ ہندستان سے جب کوئی مہمان آتا ہے تو ہمیں دلی خوشی ہوتی ہے اور ہم اسے آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔ آج آپ نے دیکھا ہوگا کہ حاضرینِ جلسہ کی ساری توجہ آپ کی طرف تھی اور آپ کی تقریر سن کے وہ بہت خوش ہو رہے تھے۔ میں نے کہا یہ تمھارے ترجمے کا کمال ہوگا۔ تقریر میں کیا رکھا تھا۔ اس نے یہ Compliment فوراً یہ کہہ کے واپس کیا کہ میں نے آپ کی تقریر کا لفظی ترجمہ کیا تھا۔ نہ کوئی لفظ اس میں بڑھایا نہ کم کیا۔

گھڑی دیکھی تو پانچ بج چکے تھے۔ یا تو بھوک اتنی شدید تھی کہ برداشت نہ ہوتی تھی اور یا پھر یہ صورت ہوئی کہ باتوں میں پانچ بج گئے۔ میں نے کہا چلیں کھانا کھالیں کہیں پھر ریسٹورنٹ بند نہ ہو جائے۔ چنانچہ دوبارہ ریسٹورنٹ میں گئے۔ کھانے کے بعد میں بل ادا کرنے لگا تو بگما نے یہ کہہ کے روک دیا کہ دام میں ادا کروں گی۔ میں نے کہا یہ غلط بات ہے اور علی گڑھ کی اصطلاح میں اسے بتایا کہ تم جونیئر ہو میں سینیئر ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ بولی نہیں، رائٹرز یونین کی طرف سے مجھے ہدایت ہے کہ کھانے کا بل آزاد سے نہ دلوایا جائے۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ریگا میں کھانے کا جو خرچ ہوگا وہ مجھے سوویٹ رائٹرز یونین پہلے ہی دے چکی ہے لیکن بگما نے نہ مانا اور کھانے کا بل جو غالباً پینتیس روپے کے

کے قریب تھا ادا کر دیا۔

کھانے کی میز پر بات چیت کا موضوع بدل گیا تھا۔ بگما ایک ہندستانی لڑکی کی طرح مجھ سے میری بیوی بچوں کے بارے میں پوچھتی رہی۔

ریسٹورنٹ سے باہر آئے تو بگمانے کہا کہ چھے بجے یونی ورسٹی میں میرا پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔ اب میں اجازت چاہتی ہوں۔ میں لفٹ تک اسے پہنچانے گیا۔ لفٹ کے قریب اس کی ایک سہیلی اسے ملی۔ گونا جس سے وہ دن میں ہوٹل میں آتے وقت میرا تعارف کرا چکی تھی۔ لفظ "گونا" کے بارے میں بگمانے بتایا کہ یہ لفظ "اگنی" سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہیں "آگ" میں دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ قدرت بھی بعض دفعہ فیاضی کی کتنی انتہا کر دیتی ہے۔ اس لڑکی کو خدا نے جس طرح حسنِ صورت، حسنِ سیرت اور کمالِ علم کی دولت سے مالا مال کیا ہے اُس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

چلتے وقت بگمانے کہا کہ ابھی آپ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے پروفیسر وکٹرز آ رہے ہوں گے۔ میں یونی ورسٹی سے دس بجے رات کو گھر واپس لوٹوں گی۔ اگر چاہیں تو اس وقت آپ مجھے ٹیلی فون کریں۔ ویسے میں کل صبح دس بجے آپ سے ملنے آؤں گی۔ یہ کہہ کے وہ اسی طرح مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی چلی گئی جس طرح مسکراہٹیں بکھیرتی آئی تھی۔ میں کمرے میں واپس آیا تو کمرہ اس کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

اتنے میں الگیز ہیڈر میرے کمرے میں داخل ہوئے اور بولے کہ نیچے پروفیسر وکٹرز آپ کے منتظر ہیں۔ نمائش کا وقت ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں اسی طرح نیچے روانہ ہو گیا اور پروفیسر وکٹرز اور الگیز ہیڈر کے ساتھ چل پڑا۔ منزلِ مقصود پر جا کے پتا چلا کہ یہ نمائش نہیں بلکہ مجسموں کی نمائش گاہ میں ایک مشاعرہ منعقد ہونے والا ہے جس میں لیتھوین کے شعرا اپنا اپنا کلام سنائیں گے۔ میں پھر اپنی بیاض ہوٹل میں چھوڑ گیا تھا۔ میں تو اس خیال میں تھا کہ نمائش میں جا رہے ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ صبح کو ایک جلسہ تھا اور یہ مشاعرہ ہے۔ چنانچہ نظم کے بارے میں پھر میں نے معذرت پیش کی۔ تقریر کی فرمائش ہوئی۔ اب کے میں نے اپنی تقریر کو روس اور ہندستان کے ادبی تعلقات تک محدود رکھا اور تفصیل سے سامعین کو اس کام سے آگاہ کیا جو روسی ادب کے متعلق ہندستان میں ہو رہا ہے۔ پروفیسر مجیب کے کام سے لے کے ظ انصاری، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس اور قمر رئیس کے کام تک ایک بھرپور جائزہ لیا۔ ساحر لدھیانوی اور مخمور جالندھری کے مقالات کا بھی ذکر کیا۔ کبیر احمد جائسی اور اجمل اجملی کے کام کا بھی۔ علی محمد لون کے ترجمے کی بھی بات کی۔ اقبال کا ذکر بھی تفصیل سے کیا۔ "خضرِ راہ" کے حوالے سے بھی اور تالستائی کے تعلق سے بھی کہ اقبال نے تالستائی کا ذکر "پیامِ مشرق" میں بھی کیا ہے اور "جاوید نامہ" میں بھی۔ "جاوید نامہ" میں تو اقبال تالستائی کا ذکر کرتے ہوئے جذبے کی ایک شدید کیفیت سے مغلوب ہو گئے ہیں اور نتیجتاً "روبائے حکیم تالستائی" والا حصہ "جاوید نامہ" کے ان حصوں میں شمار ہوتا ہے جن میں اقبال کا فن انتہائی عروج پر پہنچ گیا ہے۔ وہاں میں نے اپنے اس خیال کو بھی پیش کیا اور معلوم نہیں

اہلِ روس نے اسے کس روشنی میں لیا ہوگا کہ تالستائی، گاندھی اور اقبال ایک ہی تصویر کے مختلف پہلو ہیں اور ان تینوں کی نظریاتی مماثلت ہی میں مشرق و مغرب کے مستقبل کی نظریاتی مماثلت کا راز پنہاں ہے۔ ہم اہلِ ہندستان "تالستائی، گاندھی اور اقبال کی تثلیث" سے بے نیاز ہو کے، پریم چند، کرشن چندر، علی عباس حسینی، سہیل عظیم آبادی، فیض احمد فیض، خواجہ احمد عباس اور سردار جعفری کے فن کا تصور نہیں کر سکتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آ کے ہندستان اپنے نظریات کے مطابق اشتراکیت کی تشکیل کرتا ہے اور مارکس اور لینن کے نظریات اور تصورات کا دامن مضبوطی سے تھامنے کے باوجود اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کر سکتا جس کا نام مہاتما گاندھی ہے چنانچہ گاندھیائی نظریات ہمارے اشتراکی نظریات ہی کا ایک حصہ ہیں۔ ساتھ ہی میں نے اردو ادب پر روسی ادب کا بحیثیتِ مجموعی ایک مختصر سا جائزہ لیا اور ہندوستان میں ادب کی ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس تحریک میں چمک دمک ٹیگور کی نظموں سے بھی آئی ہے اقبال کے کلام سے بھی، پریم چند کے افسانوں سے بھی اور گاندھی جی کے لہو سے بھی۔ اب کے میرے مترجم کے فرائض پروفیسر وکٹرز نے انجام دیے جو اچھی انگریزی جانتے ہیں۔ یہاں میری انگریزی تقریر کا ترجمہ لیتھوین میں کرنا تھا اور الگیز ہیڈر لیتھوین سے نا آشنا تھے چنانچہ لیتھویا میں یار بگا میں ڈاکٹر بگما اور پروفیسر وکٹرز کی موجودگی میرے لیے ایک نعمت بیش بہا ثابت ہوئی۔

اس مشاعرے میں ایمنتر سے مفصل ملاقات ہوئی جنھوں نے دوسرے دن چھے بجے مجھے اپنے گھر چائے پر مدعو کیا۔ بعض لوگوں کو دیکھ کے پہلے ہی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کس مزاج کا انسان ہے جیسے ہمارے یہاں ڈاکٹر عالم خوند میری سر سے پاؤں تک ایک فلسفی نظر آتے ہیں اسی طرح ایمنتر ہر اعتبار سے شاعر دکھائی دیتے ہیں میں نے ایمنتر سے کہا

You look a poet every inch ۔ اس کی رگِ ظرافت پھڑکی بولا

I am trying to

اس وقت آٹھ بج چکے تھے۔ میں پروفیسر وکٹرز اور الگیز ہیڈر کی ہمراہی میں ہوٹل واپس آیا اور پروفیسر وکٹرز نے مجھے اس کام سے آشنا کیا جو یونی ورسٹی کی سطح پر لیتھویا میں ہندستانی ادب کے بارے میں ہو رہا ہے۔ یہ تصویر کا ایک اور روشن پہلو تھا جو میری نگاہوں سے اس وقت تک پوشیدہ تھا۔ پروفیسر وکٹرز نے بتایا کہ لیتھویا میں یونی ورسٹی کی سطح پر اور یونیورسٹیوں سے باہر ہندستانی ادب سے متعلق جو کام ہوا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) لیتھویا کے وہ عظیم مصنفین جو ہندستان سے متاثر ہوئے اور جن کی تصانیف میں ہندستان کا بھرپور ذکر ملتا ہے:-

۱۔ کرشیا منیر۔ انھوں نے لیتھویا کے لوک گیت جمع کیے تھے (شاید ہمارے دیوندر ستیارتھی کی طرح)، ان گیتوں میں اس امر کے اشارے ملتے ہیں کہ آریہ ہندستان میں لیتھویا سے گئے۔ ان گیتوں کو جمع کرنے کے علاوہ بھی انھوں نے ۱۸۵۶ء میں اس موضوع پر خاصا لکھا تھا۔

۲۔ آندریز یمپرس۔ یہ اپنی ایک ایپک کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی ایپک میں ہندستان

کا ذکر ملتا ہے۔

۳۔ پانس رائنس۔ مشہور عوامی شاعر جن کی ایک سو تیرھویں سال گرہ کا ذکر میں اس سے قبل کر چکا ہوں۔ یہ سنسکرت اور ہندو دھرم سے صرف متاثر ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے رگ وید کے متعدد منتروں کا لیٹوین میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

۴۔ پانس سٹنڈرا بکائنز۔ یہ بھی ایک عوامی شاعر تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں ٹیگور پر ایک نظم کہی تھی۔

۵۔ اندریزام پیٹس۔ عوامی ادیب۔ انھوں نے اُس وقت ٹیگور پر ایک مقالہ لکھا جب کہ ابھی ٹیگور کو نوبل پرائز نہیں ملا تھا۔

(ب) وہ ادیب اور شاعر جنھوں نے ہندستانی ادبیات کا ترجمہ انگریزی سے لیٹوین میں کیا:

۱۔ کاربس انگلے۔ یہ لیٹوین کے ایک مشہور شاعر اور ادیب تھے اور انھوں نے ٹیگور کی اتنی نظموں کا لیٹوین میں ترجمہ کیا ہے کہ شاید ہی کسی اور شاعر نے اپنی زبان میں کیا ہو۔

۲۔ رچرڈز رٹوزری ٹو۔ (شاعر) انھوں نے ٹیگور کی تمام تصانیف (۱۹۳۸ء۔ ۱۹۲۷ء) کو شائع کرنے میں کاربس کی اعانت کی تھی۔

۳۔ ہردا کیپے (عوامی شاعرہ) انھوں نے وشوا بھارتی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی اور ہندستان پر خاصی تعداد میں نظمیں کہیں۔

(ج) موجودہ شعرا:

۱۔ وِتانتس لڈمینز۔ شاعروں کی ایک جماعت کے صدر ہیں۔ آریوں کے متعلق انھوں نے ایک خوب صورت نظم کہی ہے۔

۲۔ مارس چاکلیو۔ انھوں نے کلکتے میں سنیتی کمار چیٹرجی کے ساتھ ان کے انتقال سے ذرا قبل ملاقات کی۔ حال ہی میں انھوں نے ہندستان پر نظمیں کہی ہیں۔

۳۔ آندریس ویجاہز۔ ان کی اکثر نظموں کا موضوع ہندستان ہے۔

۴۔ آدما پورمیل۔ انھوں نے بھی ہندستان پر متعدد نظمیں کہی ہیں۔

۵۔ ایمنیز فلڈ وزز۔ انھوں نے اپنی طویل نظم "دود عد" میں ہندستان کا بہت ذکر کیا ہے۔

۶۔ وکٹر زاو بلیس۔ انھوں نے ٹیگور پر تھیس لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سب سے اونچی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ لیٹوین، روسی اور انگریزی میں ٹیگور اور دوسرے ہندستانی موضوعات پر متعدد مضامین لکھے ہیں۔ بنگالی شعرا کی کوئی تیس کے قریب نظموں کا آپ نے ترجمہ کیا ہے۔ حال ہی میں ٹیگور پر ایک کتاب آپ نے لکھی ہے جو ایک لاکھ کی تعداد میں چھپی ہے۔

۷۔ بگما انگرادا۔ انھوں نے سروجنی نائیڈو پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

۸۔ راسما پٹ نہا۔ وبھوتی بھوشن کی شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں۔

یہ بات چیت ختم ہوئی تو پروفیسر وکٹرز نے رابندر ناتھ ٹیگور کے متعلق اپنی کتاب عنایت کی۔ یہ کتاب لیٹوین میں ہے۔ گویا پھر وہی معاملہ تھا۔ "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" ـــــ بہر طور میں اس میں ٹیگور کی تصویریں دیکھ کے لطف اندوز ہوتا رہا۔ لیٹوین کا رسم الخط روسی سے مختلف ہے۔ لاطینی ہے۔ گویا آپ اگر انگریزی جانتے ہیں تو لیٹوین عبارت کسی حد تک پڑھ لیں گے لیکن مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بالکل ہندی اور مراٹھی کا سا معاملہ ہے یا اردو اور فارسی کا سا۔

یہاں کے لوگ اپنے آپ کو قوم اور اپنی ری پبلک کو ملک کہتے ہیں۔ سارے روس میں ماسکو سمیت کوئی اس کا برا نہیں مانتا۔

کوئی دس بجے کے قریب پروفیسر وکٹرز رخصت ہوئے اور چلتے چلتے یہ کہہ گئے کہ کل ہماری یونی ورسٹی میں تین بجے "تاریخ ادب اردو" پر آپ کا لیکچر ہے۔ انگریزی جاننے والے طلبہ کی تعداد کوئی پچاس کے قریب ہے اور یہ تمام طلبہ لیکچر میں موجود ہوں گے۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوگا۔

ان کو رخصت کرنے کے بعد میں ریسٹورنٹ میں گیا۔ دو سالنوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ مجھے یہ چاہیے۔ میں ابھی کاؤنٹر ہی پر کھڑا تھا کہ تین چار ویٹریسیں وہاں جمع ہو گئیں۔ یہ وہی تھیں جنھوں نے دن کے کھانے کے وقت میری موجودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ اب یہ لیٹوین میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جو لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے ان میں سے بھی اکثر نے سر اٹھا اٹھا کے میری طرف دیکھنا شروع کر دیا اتنے میں ایک ویٹریس بولی اِندی؟ اِندی؟ دوسری نے کہا اِندیا؟ اِندیا؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہی دوسری ویٹریس کہنے لگی: "ٹیلی ویژن، یو ٹیلی ویژن یو گُد گُد۔" میں سمجھ گیا۔ غالباً جس وقت میں اپنے کمرے میں پروفیسر وکٹرز کے ساتھ باتیں کر رہا تھا صبح کے جلسے کا پروگرام ٹیلی ویژن پر آ رہا تھا اور شاید ہوٹل میں اکثر لوگ مجھے ٹیلی ویژن پر دیکھ چکے تھے۔ ٹیلی ویژن والوں نے چوں کہ بہت دیر تک مجھے ریکارڈ کیا تھا اس لیے ہوٹل میں یہ لوگ مجھے میرے لباس سے یا چہرے مہرے سے پہچان رہے تھے۔

اس رات میں کوئی رات گئے (یا صبح) کے دو بجے تک جاگتا رہا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ جب تک کوئی خاص افتاد نہ آ پڑے بغیر تیاری کے تقریر نہیں کرتا۔ آج دو تقریریں بے شک فی البدیہہ کر چکا تھا اور سبب یہ تھا کہ ان کے متعلق مجھے پہلے سے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ لیکن اب یونی ورسٹی کی تقریر کا نوٹس نصف دن قبل مل چکا تھا اس لیے موضوع کی تفاصیل پر غور کرنا ضروری تھا۔ حوالے کے لیے کوئی کتاب تو ساتھ تھی نہیں۔ یادداشت ہی پر بھروسا کرنا پڑا۔

▲

۱۲

ریگا یونی ورسٹی میں

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ آ رہی تھیں۔ بستر سے نکل کے کھڑکی میں سے جھانکا۔ ٹریفک پورے زور شور سے چل رہا تھا۔ لوگ بسوں اور ٹراموں کے انتظار میں کھڑے تھے کوئی سات بجے کا وقت تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل تھے۔ دھوپ نے ایک کیفیت انشراح پیدا کر دی لیکن جب دس بجے کے قریب میں نہا دھو کے تیار ہوا تو دیکھا کہ آسمان پھر ابر آلود ہو چکا ہے۔ دل بجھ سا گیا۔

ناشتے سے فارغ ہوا تو سوا دس بج چکے تھے۔ سگما ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اس کے گھر ٹیلی فون کیا۔ کسی بچی نے ٹیلی فون اٹھایا۔ میں نے انگریزی میں کہا۔ کیا میں سگما سے بات کر سکتا ہوں جواب لیٹوین میں ملا۔ میں نے دوبارہ سگما کا نام لیا۔ پورا نام سگما انگرادا۔ اب کے جواب انگریزی میں ملا۔

I AM HER LITTLE SISTER SIGMA HOME NO.

میں نے بتایا کہ میں پروفیسر آزاد بات کر رہا ہوں۔ ریگا ہوٹل سے۔ اور پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے سگما کہاں گئی ہیں۔ بچی نے بڑی معصومیت اور اسی شیریں آواز میں جواب دیا SIGMA YOU اور مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے پھر یہی الفاظ دہرائے SIGMA YOU میں سمجھ گیا۔ یہ کہہ رہی ہے سگما آپ ہی سے ملنے گئی ہے۔

میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ ادھر سے سگما کی آواز تھی۔ بولی میں آ گئی ہوں۔ آپ اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ آپ کو OPEN AIR MUSEUM میں لے چلنا ہے۔ میں نے کہا میں تیار ہو چکا ہوں اور نیچے آ رہا ہوں۔ نیچے گئے۔ گاڑی میں بیٹھے اور اوپن ایئر عجائب گھر کا رخ کیا۔ راستے میں میں نے سگما کو بچی کی بات چیت سنائی۔ سگما بولی SIGMA YOU سے وہ یہ مراد لے رہی تھی کہ سگما آپ کو ٹیلی فون کرے گی۔

کوئی پندرہ منٹ میں ہم لوگ اوپن ایر عجائب گھر میں پہنچ گئے۔ معلوم نہیں اس کا رقبہ کیا ہے۔ لیکن سگما نے بتایا کہ دنیا بھر میں اس سے بڑا اوپن ایر عجائب گھر اور کوئی نہیں ہے اسے دیکھ کے مجھے راولپنڈی کا ٹوپی پارک یاد آ گیا۔ اب شاید اس کا نام کچھ اور ہے۔

اس عجائب گھر کی سیر دراصل لیٹویا کے ماضی میں ہمارا سفر تھا۔ مختلف مکانوں میں ساز و سامان کو دیکھ کر لیٹویا کی تین صدیاں پہلے کی زندگی کا نقشہ نظر میں پھر گیا۔ اپنی پرانی یادگاروں کو اس طرح سے سنبھال کے رکھنا بہت بڑا کام ہے۔

عجائب گھر میں سگما نے ایک چٹان دکھائی جس پر کچھ عبارت کندہ تھی۔ گمان میرا یہ تھا کہ سنسکرت ہے کیوں کہ رسم الخط وہی تھا۔ سگما نے بتایا کہ اس عبارت کو Decipher کرنا ابھی باقی ہے۔ میں نے کہا پروفیسر رامانشنکر جوشی کل پرسوں یہاں آ رہے ہیں۔ انھیں یہ چٹان دکھا دیجیے گا۔ غالباً وہ کوئی رہنمائی کر سکیں گے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد جب بھبنیشور (اڑیسہ) میں میری پروفیسر رامانشنکر جوشی سے ملاقات ہوئی اور میں نے اس چٹان کا ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ اس تحریر کا حل غوامض نہیں کر سکے۔ بہر طور

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

ایک بجے ہوٹل واپس آئے۔ سگما نے کہا کہ اب میں پونے تین بجے آؤں گی اور آپ کو یونی ورسٹی لے جاؤں گی جہاں آپ کو تقریر کرنا ہے۔ ہم لوگ کھانے سے فارغ ہوئے۔ ذرا سا آرام کیا۔ سگما طے شدہ وقت پر آئی اور مجھے اور انگیز بیڈر کو فارن لینگویجز ڈپارٹمنٹ میں لے گئی۔ دیواروں پر گوئٹے، دانتے، ٹالسٹائی اور شیکسپیئر کی تصویریں آویزاں تھیں۔ وہاں سے جلسہ گاہ میں گئے۔ ہال تقریباً بھرا ہوا تھا۔ میں نے تقریر سے پہلے بلیک بورڈ پر ہندستان کا نقشہ بنایا اور اردو کی ابتدا سے لیکچر شروع کر کے اسے جدید شعرا اور نثر نگاروں تک لے آیا۔ لیکچر کوئی ایک گھنٹہ رہا۔ اس دوران میں طلبہ کچھ نوٹس لیتے رہے۔ بعد میں سوالات ہوئے جو اردو زبان کے متعلق کم اور ادب اور تصوف کے متعلق زیادہ تھے۔ میری شاعری کے متعلق بھی سوالات کیے گئے۔ تقریر ختم ہوئی تو کلام سنانے کی فرمائش ہوئی۔ میں نے دو نظمیں سنائیں اور پھر ان کا انگریزی میں ترجمہ پیش کیا۔

وہاں سے پھر ہوٹل واپس آئے چھ بجے ایمنز نے اپنے گھر دعوت دی تھی۔ سگما اور پروفیسر وکٹرز نے کہا تھا کہ ہم آپ کو لے کے جائیں گے۔ میں نے اپنے کمرے میں ذرا آرام کیا اور چھ بجے کے قریب تیار ہو کے بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سگما اور پروفیسر وکٹرز کے ساتھ ایمنز کو بھی موجود پایا۔ ایمنز نے کہا ہم نے سوچا آپ کا پروگرام بہت بھرپور ہے۔ آپ تھکے ہوئے ہوں گے اس لیے ہم لوگ خود ہی یہاں آ گئے ہیں۔ نیچے چل کے ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں۔ یہ دعوت اب پروفیسر وکٹرز کی طرف سے تھی۔ بل ایک سو اسی روپے کا آیا۔ ایمنز میرے لیے اپنی نظموں کے انگریزی ترجمے لائے تھے۔ ٹائپ کیے ہوئے۔ میں نے کہا ان میں سے دو ایک کو میں اردو میں منتقل کروں گا۔ ایمنز نے مجھ سے ان نظموں کے

انگریزی ترجمے مانگے جو میں نے یونی ورسٹی میں پڑھی تھیں۔ میں نے کہا وہ ترجمے تو فی البدیہہ تھے اور کاغذ پر لکھے ہوئے نہیں تھے۔ میں اب جموں جا کے اپنی بعض نظموں کے انگریزی ترجمے آپ کو بھیجوں گا۔

ایمنٹز لیتھوانیا کا مقبول ترین شاعر ہے۔ اس وقت تک اس کی نظموں کے سات مجموعے چھپ چکے ہیں اور کوئی مجموعہ تیس ہزار کی تعداد سے کم نہیں چھپا۔ بعض پچاس ہزار اور ایک لاکھ تک گئے ہیں۔ اس کے جو مجموعے صرف پچیس یا تیس ہزار کی تعداد میں چھپے ہیں وہ اس لیے کہ زیادہ کے لیے کاغذ دست یاب نہیں ہو سکا۔ یہی صورت حال وکٹرز کی کتاب کی ہے جو انھوں نے ٹیگور پر لکھی ہے۔ یہ کتاب ایک لاکھ چھپی ہے۔ لیکن بازار میں اس کے بکنے کی نوبت نہیں آئی۔ دوران طباعت ہی میں ایک لاکھ کے آرڈر بک ہو گئے تھے۔

میں نے پروفیسر وکٹرز سے پوچھا کہ ایمنٹز کام کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں کتابوں سے بہت رائلٹی ملتی ہے۔ انھیں شاعری کے علاوہ کوئی کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مجھے ایمنٹز کی زندگی پر رشک آیا۔

چائے کی میز پر بات چیت کے موضوع کا کینوس بہت وسیع رہا۔ ہندستان میں اردو سے لے کے سیاسیاتِ مشرق و مغرب۔ سب زیرِ بحث آئیں اور یہ جو میرا خیال تھا کہ روس میں سیاسی موضوعات پر عام طور سے بات نہیں کی جاتی غلط نکلا۔

چائے ختم ہوئی تو ایمنٹز نے تجویز کیا کہ اس وقت سب یانس رائنس کی قبر پر چلیں۔ لیتھوانیا کے قبرستانوں کے متعلق اس نے بتایا کہ ان کی بہت عمدہ طریقوں سے دیکھ بھال کی جاتی ہے اور یہ ہم لوگوں کے لیے پارکوں کا کام دیتے ہیں۔

باہر نکلے تو ایمنٹز کی گاڑی دیکھی۔ بہت بڑی اور بہت گراں گاڑی تھی جو روس میں کم لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ ہم پانچوں — ایمنٹز، سگما، وکٹرز، الیگزینڈر اور میں — اس میں بیٹھے اور ریگا کی کشادہ اور دل کش سڑکوں سے گزرتے ہوئے قبرستان جا پہنچے۔ یانس رائنس کی قبر کی تصویر میں ایک کتاب میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس کی بیوی بھی شاعرہ تھی۔ دونوں کی قبریں ساتھ ساتھ ہیں اور اب دونوں کو ملا کے ایک کر دیا گیا ہے۔ اس قبر پر ایک پلیٹ فارم بنا ہے اور پلیٹ فارم کے اوپر ایک خوب صورت مجسمہ نصب ہے۔

پروفیسر وکٹرز نے بتایا کہ وہ کل صبح پانچ بجے کے طیارے سے ماسکو جا رہے ہیں اور وہاں سے ہندستان جائیں گے۔ ان کا دس ماہ کا شانتی نکیتن میں قیام کا پروگرام ہے۔ میں نے کہا میں ان شاء اللہ آپ سے آیندہ ماہ شانتی نکیتن میں ملوں گا، کلکتہ یونی ورسٹی کی طرف سے اقبال صدی تقاریب منائی جا رہی ہیں اور ان میں شرکت کی دعوت مجھے مل چکی ہے۔

یہاں آمنے سامنے دو قبرستان تھے۔ دونوں بہت خوش نما پارک تھے ان میں ہم لوگ کافی دیر تک چہل قدمی کرتے رہے اور ہندستان اور لیتھوانیا کے ادب کے مختلف پہلوؤں پر بات

ہوتی رہی۔ یہاں کشمیر کی طرح غروب آفتاب کے بعد روشنی کافی دیر تک رہتی ہے چناں چہ ہم کوئی پونے نو بجے تک ان پارکوں میں گھومتے رہے۔ نو بجے ایمنٹز نے ہمیں واپس ہوٹل میں پہنچا یا۔ یہاں سگما، وکٹرز اور ایمنٹز ہم سے رخصت ہوئے۔ سگما نے کہا کہ وہ اب رات کو دس بجے آئے گی اور ہمیں اسٹیشن لے جائے گی۔

ٹھیک دس بجے سگما کا ٹیلی فون آیا کہ میں آگئی ہوں۔ ہم لوگ نیچے اترے۔ اسٹیشن چار قدم پر تھا۔ اگر میرے پاس دو سوٹ کیس نہ ہوتے تو پیدل کا رستہ تھا۔ گاڑی میں بیٹھے اسٹیشن پہنچے۔ سگما رخصت طلب ہوتے وقت بڑے تپاک سے کہنے لگی۔ ہو سکتا ہے ہم بہت جلد پھر ملیں۔ میں نے کہا کہ اچھی باتوں کی امید ہمیشہ کرنا چاہیے۔ اگرچہ میری تمھاری ملاقات کا اب بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ہاں خط و کتابت کی بات دوسری ہے۔ سگما نے دونوں ہاتھ جوڑ کے نمستے کہی اور رخصت ہوئی۔ دراصل اس کا ہمیشہ یہی طریق کار رہا۔ ملتے وقت اور رخصت ہوتے وقت وہ نمستے ہی کہتی تھی۔ شاید میں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ ماسکو میں مادام لوپاتینا نے السلام علیکم کہہ کے میرا استقبال کیا تھا۔ میں نے جواب میں وعلیکم السلام تو کہہ دیا لیکن ڈر تھا کہ اگر انھوں نے عربی میں بات چیت شروع کر دی تو اپنا بھرم کھل جائے گا۔

سگما رخصت ہوئی تو ہم لوگ ریل میں اپنے ڈبے میں بیٹھے۔ ہماری برتھوں پر بستر بچھے لگے تھے۔ ریل صحیح وقت پر پونے گیارہ بجے روانہ ہوئی۔

فرسٹ کلاس میں سفر ماسکو سے ریگا تک میں کر چکا تھا۔ ریگا پہنچ کے میں نے الیگزینڈر سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو سیکنڈ اور تھرڈ میں بھی سفر کرنا چاہیے تاکہ ہر درجے کے بارے میں واقفیت ہو سکے چنانچہ ریگا سے لینن گراڈ تک بکنگ ہم نے سیکنڈ کلاس میں کرائی۔ یہ قریب قریب ہمارے فرسٹ کلاس کی طرح تھا۔ اس میں چار برتھ تھیں۔ ایک خاتون اور ایک مرد اس میں پہلے سے موجود تھے۔ عورت بہت متواضع اور مہمان نواز تھی۔ اس نے ہمیں کھانا پیش کیا لیکن وکٹرز کی دعوت کے بعد پیٹ میں گنجایش نہیں تھی۔ اس نے چاکلیٹ اور سیب ہمارے سامنے رکھے۔ الیگزینڈر نے سیب اور میں نے چاکلیٹ لے لی۔

صبح جاگے تو ریل لینن گراڈ کے مضافات میں پہنچ چکی تھی۔ غالباً رات بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ اس وقت بھی ہلکی ہلکی بوندا باندی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ باہر سے نم آلود ہو چکا تھا۔ اس لیے مناظر ٹھیک سے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن تھوڑی دیر میں بادل چھٹ گئے۔ دھوپ نکل آئی اور نظریں باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہونے لگیں مگر اس وقت تک جنگلوں اور کھیتوں کی جگہ اونچے اونچے مکانات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

۱۳

لینن گراڈ

عجائب گھر اور سوویٹ رائٹرز یونین

ریل پونے نو بجے لینن گراڈ پہنچی۔ اسٹیشن پر رائٹرز یونین کی طرف سے اولگا موجود تھیں
وہ ہوٹل لے گئیں۔ اس کا نام تھا یورپین ہوٹل۔ یہ ہوٹل نیا ہے لیکن جدید طرز پر نہیں بلکہ شاہانہ
طرز پر بنایا گیا ہے۔ کمرے میں پاؤں رکھتے ہی گمان ہوا جیسے کسی محل میں داخل ہو گیا ہوں۔ میز
کرسیوں اور صوفوں کی ساخت وکٹورین دور کے فرنیچر کی یاد دلا رہی تھی۔ کمرے میں ایک بہت
بڑا شینڈلیر آویزاں تھا جس میں موم بتی کے ڈیزائن کے متعدد بلب لگے تھے۔ سامنے دیوار پر
ایک تصویر تھی جو کسی شہزادی یا ہیروئین کی معلوم ہو رہی تھی۔

کمرے میں سامان رکھ چکے تو مجھ سے اولگا نے پوچھا کہ آپ یہاں کیا کیا دیکھنا چاہیں گے۔
میں نے کہا زار روس کا ونٹر پیلس (عجائب خانہ) بعض ادیبوں بالخصوص، زوگروف بار نیکو
وکٹر بالن اور گیور شینا سے ملاقات، لینن گراڈ رائٹرز یونین کے دفتر میں سکریٹری سے ملاقات۔
اس کے علاوہ جو آپ چاہیں۔ چنانچہ اسی طرح سے پروگرام شروع ہوا۔

سب سے پہلے ہم ونٹر پیلس میں پہنچے۔ یہ پیٹر اعظم کا محل تھا جو اب لینن
گراڈ کے ہر میٹیج عجائب گھر کا ایک حصہ ہے۔ یہ عجائب گھر لینن گراڈ کا سب سے
بڑا عجائب گھر ہے اور دنیا کے سب سے بڑے پانچ عجائب گھروں میں ایک
ہے۔ اس میں طویل و عریض کمروں کی تعداد دو ہزار ہے اور نمائش کی چیزوں کی تعداد پانچ
کروڑ۔ عجائب گھر کے گائڈوں کا کہنا ہے کہ اگر ہر شے کو آپ صرف آدھے منٹ کے لیے دیکھیں اور
سات گھنٹے روزانہ دیکھتے رہیں، ہفتے اور اتوار سمیت تو تمام اشیا کو دیکھنے کے لیے نو برس
کی مدت درکار ہے۔ اب آپ اندازہ کر لیں کہ میں نے ایک گھنٹے میں کیا دیکھا ہوگا۔ ایک
جھلک بھی نہ دیکھ سکا۔ تصویریں، مجسمے اور مصنوعات نہ جانے کہاں سے کہاں تک سجی ہوئی
رکھی ہیں۔ پیکا سو، وان گاگ اور مایکل انجلو کے نتائج قلم دیکھے۔ مایکل انجلو کا بنایا ہوا

ایک مجسمہ بھی۔ میں جب متعدد کمروں میں چلتے چلتے تھک گیا تو میں نے اولگا سے کہا کہ اب
مجھے اس عجائب گھر کے اس حصے میں لے چلو جو زار روس کا ڈرائنگ روم تھا یا ڈائننگ روم
یا بیڈ روم یا اس کا دفتر۔ چنانچہ وہ مجھے زار کے ڈائننگ ہال میں لے گئی۔ یہ کمرہ کیا تھا ایک
عبرت کا نظارہ تھا۔ اولگا نے بتایا کہ جب لینن کی نوجوں نے سنیٹ پیٹرس برگ یا پیٹروگراڈ
کو گھیرے میں لے لیا تو زار کی حکومت اسی کمرے۔ ڈائننگ ہال۔ میں منتقل ہو گئی اور
اسی کمرے میں اس حکومت کے تمام ارکان کو گرفتار کیا گیا۔ اس وقت رات کے دو بج چکے تھے
گرفتاری دو بج کے دس منٹ پر عمل میں آئی اور ڈائننگ ہال میں دیوار پر آویزاں کلاک
کو عین اسی وقت بند کر دیا گیا۔ اس وقت وہی کلاک میرے سامنے تھا اور اس پر دو بج کے
دس منٹ کا وقت تھا۔ اس کلاک پر یہ وقت ہمیشہ کے لیے ٹھہر چکا ہے اور پیٹروگراڈ کے
زوال اور عوامی طاقتوں کی فتح کی داستان سنا رہا ہے۔

زار کا ڈرائنگ روم دیکھا۔ شاہانہ ٹھاٹ باٹ آنکھوں میں چکا چوند کا عالم پیدا کر رہا
تھا۔ ملحقہ کمرہ اس کا دفتر تھا۔ اس میں دیواروں اور دروازوں پر سونے کا پانی کتنی مقدار
میں چڑھا ہوا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک بار جب آگ لگنے سے
یہ ہال تباہ ہو گیا تو اس کو اپنی اصلی حالت پر واپس لانے کے لیے نو کلو گرام خالص سونا
دیواروں اور دروازوں پر پانی چڑھانے کے لیے استعمال کیا گیا۔

ممکن ہے قارئین کے لیے یہ بات باعث حیرت ہو کہ روس کی عوامی حکومت کو کیا پڑی
تھی کہ ہال کو پھر شاہانہ انداز پر واپس لانے کے لیے نو کلو گرام خالص سونا استعمال کرتی
اور زار شاہی کی یاد کو تازہ کرتی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اپنی تاریخ کے ہر ورق کو صحیح
طور پر پیش کرنا کسی بھی ملک اور کسی بھی قوم کے لیے اس کی عظمت کی ایک دلیل ہے۔ اہل روس
کے دل میں اپنی تاریخ کے لیے ایک خاص احترام ہے چنانچہ پیٹر اعظم (پیٹر اول) کا بت
اور اس کی یادگاریں روس میں اور بالخصوص لینن گراڈ میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ اس
کا سارا سامان، میز، کرسی، لکھنے کی میز سب کچھ محفوظ رکھا ہے۔

میں اس عجائب گھر سے باہر آیا تو سامنے دریائے نیوا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔
اس کے کنارے تھوڑی دیر کے لیے کھڑا ہوا۔ ہوا اتنی تیز اور سرد تھی کہ ہانہال کی ہوا یاد
آ گئی۔ دریا میں، ایک جزیرے پر پیٹر اور پال کا قلعہ تھا جہاں سے سینٹ پیٹرز برگ
(پیٹروگراڈ یا لینن گراڈ) کی ابتدا ہوئی تھی۔ دریا پر کشتیاں اور جہاز رواں دواں تھے اور جہاں تک نگاہ کام کرتی
تھی سارا شہر ایک عالم طلسمات کی طرح نظر آ رہا تھا۔ یہی کیفیت ماسکو میں بھی تھی۔ میں ان شہروں کا
ایک ایک عجائب گھر کیا دیکھتا یہ شہر ہی میرے لیے عجائب گھر سے کم نہ تھے۔ ایک دریا کا ذکر آیا ہے
تو یہ بھی سن لیں کہ لینن گراڈ میں انھتر دریا اور نہریں ہیں اور ان پر چار سو پل بنے ہیں۔

ڈیڑھ بجے ہوٹل میں واپس آئے۔ کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے میں
لیٹ گیا۔ اس سفر میں پہلی بار آج مجھے گھر کی یاد آئی، وملا، آورش، چندر کانت، اتیتا،

رینو، پونم، مکتا سب یاد آئیں۔ پرملا بھی جو اس وقت دہلی کے مقابلے میں مجھ سے زیادہ قریب تھی، لندن میں — لیکن لندن جانے کا میرے پاس وقت نہیں تھا — ماں جن کا ایک برس قبل انتقال ہوا تھا اس سفر میں مجھے بہت یاد آئی تھیں لیکن اس روز ان کی یاد نے تڑپا دیا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ابھی کل ہی ریگا میں مجھے خاموش دیکھ کر بیگما نے پوچھا تھا Are you feeling home-sick? اور میں نے کہا تھا نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ گھر سے آئے ابھی دس ہی دن تو ہوئے ہیں اور دس گیارہ دن میں گھر واپس پہنچ جاؤں گا۔ بعض دفعہ ہندستان ہی میں ایک سفر دس دس گیارہ گیارہ دن کا ہو جاتا ہے۔ افغانستان گیا تھا تو بھی دس بارہ دن بعد واپس آیا تھا لیکن آج، ایک ہی دن بعد مجھے گھر کی یاد نے بے چین کر دیا تھا۔

اسی عالم میں مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو تین بجے کا وقت تھا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا۔ کپڑے تبدیل کر ہی رہا تھا کہ الیگزینڈر آ گئے اور ہم دونوں طے شدہ پروگرام کے مطابق لینن گراڈ رائٹرز یونین کے دفتر روانہ ہو گئے۔

روانگی سے قبل معلوم ہوا کہ سوویٹ رائٹرز یونین کی دعوت پر شام کے تین مصنفین ان دنوں روس کا دورہ کر رہے ہیں اور آج لینن گراڈ میں ہیں۔ یہ ڈیلیگیشن اسی یورپین ہوٹل میں مقیم تھا۔ الیگزینڈر کے بڑے بھائی اینڈریو ان کے ساتھ مترجم کے طور پر کام کر رہے تھے۔ میں رائٹرز یونین کے دفتر میں پہنچا تو ان کی گاڑی بھی وہیں آ کے رکی۔ ان سب سے تعارف وہیں رائٹرز یونین کے دفتر میں ہوا۔ یہ ادیب تھے انطون مقدری عبدالغنی حجازی اور عبدالرحیم الحمصی۔ آخرالذکر نے بتایا کہ وہ کئی برس سے اقبال پر کام کر رہے ہیں اور اس وقت تک اقبال پر تین کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان سے مل کے مجھے حیرت آمیز مسرت ہوئی۔ انھوں نے وہیں رائٹرز یونین کی کتابوں میں رکھا ہوا، اپنا مجموعۂ کلام مجھے دکھایا جس میں ایک نظم اقبال کے متعلق تھی اور اس کا عنوان تھا "اقبال الشاعر والفیلسوف"۔ عنوان تو میں نے پڑھ لیا لیکن نظم نہ پڑھ سکا۔ اس پر الیگزینڈر نے مجھ سے پوچھا آپ عربی جانتے ہیں؟ میں نے انھیں بتایا کہ ہم اردو والوں کے لیے عربی کے بعض الفاظ کا پڑھ لینا مشکل نہیں لیکن بعض الفاظ کو صحیح پڑھ لینے سے زبان نہیں آ جاتی۔

الیگزینڈر برانسکی رائٹرز یونین کی لینن گراڈ برانچ کے سکریٹری ہیں۔ انھوں نے رائٹرز یونین کے متعلق ہم لوگوں کے علم میں اضافہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ لینن گراڈ میں شاعروں اور ادیبوں کی تعداد تین سو ہے۔ یہ سب یونین کے ممبر ہیں۔ ممبر بننے کے لیے شرط یہ ہے کہ ممبر بننے والے شاعر یا ادیب کی کم از کم دو تین کتابیں چھپ چکی ہوں۔ ملک پندرہ ری پبلکوں پر مشتمل ہے اور ہر ری پبلک کے دارالحکومت میں ایک رائٹرز یونین ہے۔ کسی کسی ری پبلک میں ایک سے زیادہ یونینیں کام کر رہی ہیں۔ مثلاً لینن گراڈ دارالحکومت نہیں ہے لیکن بڑا شہر ہے یہاں یہ یونین موجود ہے جس کے دفتر میں آپ بیٹھے ہیں۔ اسی طرح بعض اور بڑے شہروں میں

بھی جو دارالحکومت نہیں ہیں یونینیں قائم ہیں۔

لینن گراڈ رائٹرز یونین کا ایک بورڈ ہے۔ بورڈ کے چودہ ممبر ہیں اور ان کا انتخاب ہر دو سال بعد ہوتا ہے۔ تین سکریٹری ہیں۔ ایک فرسٹ سکریٹری اور دو سکریٹری۔ یہ تینوں تنخواہ پاتے ہیں اور پورا وقت یونین کو دیتے ہیں۔

یونین شاعروں اور ادیبوں کے تمام مسائل حل کرتی ہے۔ انھیں مکان کی ضرورت ہو تو مکان دلواتی ہے۔ کسی کتاب کی تکمیل کے لیے سیر و سفر کی ضرورت ہو تو ان کے لیے اخراجاتِ سفر کا انتظام کرتی ہے۔ ان کے لیے ایسے مکان بنواتی ہے جہاں وہ جا کے چند روز ہنگاموں سے دور دہ کے یکسوئی کے ساتھ مطالعہ اور تخلیقی کام کر سکیں۔ مصنفین کو ایسے مکانات لینن گراڈ کے مضافات میں بھی مل سکتے ہیں اور اگر وہ چاہیں تو کوہ قاف کے علاقے میں بھی۔ ان کی کتابیں چھاپنے کی ذمہ داری بھی یونین ہی پر ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کی کتابیں چھاپنے کے علاوہ لینن گراڈ یونین چار میگزین شائع کر رہی ہے۔ نیوا اور زدا اور اور ورا اور ایک میگزین بچوں کے لیے۔ اس کے زیرِ اہتمام تین اشاعتی ادارے کام کر رہے ہیں۔ جن میں ایک صرف بچوں کی کتابیں چھاپنے کے لیے وقف ہے۔ باقی دو میں سے ایک ادارہ صرف فکشن، کلاسیکی ادب اور دوسری زبانوں کے ترجمے شائع کرتا ہے۔

یہ بات چیت ابھی چل ہی رہی تھی کہ ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ تاسیانا تھی۔ تاسیانا روسی کے علاوہ جو اس کی مادری زبان ہے اردو، ہندی اور انگریزی جانتی ہے اور لینن گراڈ یونی ورسٹی میں اردو پڑھاتی ہے۔ اس نے بتایا کہ یونی ورسٹی میں اردو کے دو ٹیچر ہیں۔ ایک تاسیانا خود اور دوسرے وکٹر بالِن جو دو سال لکھنؤ میں رہ چکے ہیں وکٹر بالِن صدر شعبۂ اردو ہیں اور پریم چند پر تھیسس لکھ رہے ہیں۔ تاسیانا نے کہا کہ پرسوں ہم آپ کو اپنی یونی ورسٹی میں دعوت دے رہے ہیں اس وقت آپ کی پروفیسر بالِن سے بھی ملاقات ہوگی اور طالب علموں سے بھی۔ طالب علموں کی تعداد کے بارے میں اس نے بتایا کہ صرف تین ہیں۔ دو طالب علم اور ایک طالبہ۔ وجہ یہ تھی کہ اردو اسی سال ہی شروع ہوئی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ تعداد بڑھ جائے گی۔ ہاں یاد آیا "تاسیانا نے پرسوں کہا تو کہا۔ ہم پرسوں آدینہ کے روز آپ کو یونی ورسٹی میں دعوت دے رہے ہیں۔ جمعہ کی جگہ آدینہ کا لفظ سن کے مجھے حیرت ہوئی۔ ویسے میرے پوچھنے پر تاسیانا نے بتایا کہ وہ "جمعہ" کا لفظ بھی جانتی ہے۔

تاسیانا نے بتایا کہ یونی ورسٹی میں ہندی کی تعلیم مقابلتاً زیادہ ہے۔ اکثر طلبہ ہندی پڑھ رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ لینن گراڈ میں ایک سیکنڈری اسکول ہے جہاں بچوں کو ہندی پڑھائی جاتی ہے۔ تاسیانا ابھی وہاں موجود ہی تھی کہ پروفیسر بالِن آ گئے۔ ان سے بھی دیر تک اردو ہی میں باتیں ہوتی رہیں۔

یہاں سے اٹھ کے ہم لوگ واپس ہوٹل آ گئے۔ رستے میں الیگزینڈر نے ایک خاص عمارت دکھائی۔ اس کا نام تھا "توریچیس کیا محل" Tauricheskiya Palace

الگزینڈر نے بتایا کہ زار کا یہ محل اب کمیونسٹ پارٹی کا سب سے بڑا اسکول ہے جہاں مارکسزم اور لینن ازم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ الگزینڈر نے وہ عمارت بھی دکھائی جہاں انقلابی حکومت نے کام شروع کیا تھا۔ یہ عمارت بھی زارشاہی کے زمانے میں ایک محل تھا۔ اب یہاں کمیونسٹ پارٹی کا دفتر ہے۔ اس میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کارل مارکس کا مجسمہ، بائیں ہاتھ اینگلز کا مجسمہ اور سامنے لینن کا مجسمہ نظر آتا ہے۔

رات کو کھانے میں ایک بہت عمدہ چیز مل گئی اور وہ بھی محض میری غلطی سے ملی تھی۔ میں نے دہی مانگا۔ بند ڈبا ملا۔ کھولا تو دہی کی جگہ لسّی نکلی۔ ماسکو میں جب میں دہی مانگتا تھا تو دہی ملتا تھا۔ آج دہی کے نام پر لسّی پینے کو مل گئی اور وہ بھی روس میں۔

▲

پروفیسر آزاد کی تقریر کے بعد جلسے میں آئے ہوئے بچے ان سے آٹوگراف لے رہے ہیں

(۱۴)

لینن گراڈ پر ایک طائرانہ نظر

دوسرے دن صبح جاگا تو کمرے میں دھوپ آرہی تھی۔ بستر سے نکل کے کھڑکی میں سے دیکھا۔ آسمان صاف تھا اور آس پاس کی عمارتیں چمک دمک رہی تھیں۔ ساڑھے نو بجے تک میں نہا دھو کر ناشتے سے فارغ ہوگیا۔ ناشتے کا یہاں عجب طریقہ دیکھا۔ بارہ روپے ناشتے کے دام تھے اور ناشتے میں جو چاہے لو۔ کل دن کے کھانے میں بھی یہی صورت تھی۔ چھتیس روپے کھانے کے دام تھے اور کھانا اپنی مرضی سے پلیٹوں میں ڈال لو۔ گویا نہ بفے کا طریقہ اور نہ ریسٹورنٹ کا۔ درمیانی راستہ۔ یہ بات ماسکو یا ریگا میں نظر نہیں آئی۔

دس بجے او لگا آگئی، گاڑی لے کے۔ اور ہم لوگ پیٹر اعظم کا سمر پیلس (قصرِ گرما) دیکھنے نکلے۔ یہ خاصا دور تھا۔ کوئی پون گھنٹہ جانے میں لگا۔ ہماری گاڑی لینن گراڈ سے باہر نکلی۔ کچھ دیر ایک دریا کے کنارے کنارے چلی۔ اس کے بعد سبزہ زار نظر کے سامنے تھے۔ پھر جنگل شروع ہوگئے۔ ان میں کہیں کہیں اِکّا دُکّا مکان بنے ہوئے تھے۔ ٹریم کی پٹری ان جنگلوں میں سے بل کھاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں اس پر سے تین ڈبوں پر مشتمل ایک ٹریم گزری تو مجھے جوش ملیح آبادی کی نظم "جنگل کی شاہزادی" یاد آگئی ——

"اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں"

کوئی گیارہ بجے ہم محل میں جا پہنچے۔ ہم سے پہلے کوئی تیس پینتیس بسیں دنیا بھر کے سیاحوں کو لے کے وہاں پہنچ چکی تھیں۔ ایک بہت لمبا کیو (Q) لگا تھا لیکن ہمیں کیو میں کھڑے ہونے کی زحمت نہیں کرنا پڑی اور سیدھے محل اور اس سے ملحقہ باغات میں چلے گئے۔ ہندستان سے آئے ہوئے مہمان شاعر کے لیے یہ خاص رعایت تھی۔ گیارہ ہی بجے وہاں موسیقی شروع ہوتی ہے اور ساتھ ہی فوارے چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ متعدد مجسمول کے سامنے جن پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے۔ یہ فوارے عجب بہار دکھاتے ہیں۔ محل اونچائی پر ہے اور اس کے باغات نیچے ہیں جن میں زینوں سے اتر کے جانا پڑتا ہے جیسے کشمیر کا راج بھون لیکن رتبے کا کوئی مقابلہ نہیں۔ کشمیر کے متعدد راج بھون اس میں سما سکتے ہیں۔

اِس محل کو جرمنوں نے، دوسری جنگِ عظیم میں کافی نقصان پہنچایا تھا۔ بعد میں لاکھوں روپے خرچ کر کے اسے اپنی اصلی حالت پر واپس لایا گیا۔ اِس محل کا پچاس فی صد سامان بھی جرمن اٹھا کے لے گئے تھے جو جنگ کے خاتمے پر روس کی حکومت واپس لائی۔ مجسمے اٹھارویں اور انیسویں صدی کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ چشموں کی تعداد ایک سو ہے۔ ہم لوگ باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ دیکھا ایک درخت کی شاخوں اور پتوں سے پانی کی دھاریں پھوٹ رہی ہیں۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ درخت مصنوعی ہے۔ لوہے وغیرہ کی طرح کی کسی چیز کا بنا ہوا ہے اور درخت نہیں ہے بلکہ فوارہ ہے۔ اور توجہ سے دیکھا تو اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے اور بھی کئی درخت اسی طرح کے نظر آئے۔

ایک فوارہ اور بھی زیادہ عجیب و غریب قسم کا تھا۔ خشک پڑا تھا۔ اس کے آس پاس کی زمین پتھریلی تھی۔ ان پتھروں میں ایک پتھر وہ تھا جس پر پاؤں رکھنے سے فوارہ چل پڑتا تھا۔ میں نے کئی پتھروں پر پاؤں رکھا لیکن صحیح پتھر پر پاؤں نہ پڑ سکا۔

سامنے پیٹر اعظم کا وہ محل تھا جو اس نے ڈچ طرزِ تعمیر پر بنوایا تھا۔ اس سے عین ملحقہ فن لینڈ کی خلیج تھی جسے دیکھنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا۔ اس کے سامنے دوسرے کنارے پر کہیں فن لینڈ کی سرزمین شروع ہو رہی ہوگی۔ سنا ہے اگر موسم صاف ہو تو دوربین سے فن لینڈ کا ساحل نظر آتا ہے۔ گھوڑے کے سُم کی طرح چکر کاٹتے ہوئے ساحل پر دائیں طرف اور کسی حد تک سامنے لینن گراڈ آباد ہے۔ دراصل دریاؤں اور نہروں نے لینن گراڈ کو بیالیس جزیروں میں تقسیم کر رکھا ہے جن پر ساڑھے چالیس لاکھ کی آبادی کا یہ شہر آباد ہے۔

سہ پہر کے تین بجے پھر شہر کی سیاحت شروع ہوئی۔ ہوٹل سے نکلے۔ دریائے موئیکا کے کنارے چلے۔ کئی دفاتر، کئی باغات اور کئی محلات کے سامنے سے گزرے۔ ونٹر پیلس (قصرِ سرما) کو آج ایک بار پھر دیکھا لیکن اب کے باہر سے۔ اس کے سامنے سترھویں، اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی سربفلک عمارتیں کھڑی تھیں جو فنِ تعمیر کے مختلف نمونوں کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ پیٹر پال قلعے کو جو لینن گراڈ کا سنگِ بنیاد ہے اور زیادہ قریب سے دیکھا۔ اس میں متعدد زاروں (شاہانِ روس) کی قبریں ہیں۔ گورکی ایک زمانے میں یہیں قید رہا۔ اب یہ عمارت ایک عجائب گھر ہے۔ لینن گراڈ میں عجائب گھروں کی تعداد سولہ ہے لیکن میں نے یہاں ونٹر پیلس (قصرِ سرما) کے علاوہ کوئی عجائب گھر نہیں دیکھا کیوں کہ جیسے پہلے بتا چکا ہوں سارا شہر ہی مجھے ایک عجائب گھر معلوم ہو رہا تھا۔ علمی ادبی اور تہذیبی اداروں کی بھی کمی نہیں ہے۔

اسی سیاحت میں وہ مکان بھی دیکھا "جو پشکن ہاؤس" کے نام سے مشہور ہے لیکن یہ دراصل پشکن کا گھر نہیں ہے۔ یہ ایک علمی عجائب خانہ ہے جس میں پشکن، گورکی، دستووسکی اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودات رکھے ہیں۔ اس کے قریب ہی لینن گراڈ یونیورسٹی ہے۔ لینن نے اسی یونیورسٹی سے لا (Law)

کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس کے علاوہ ترگنیف اور نکراسف ایسے ادیب اسی یونیورسٹی کی پیداوار ہیں۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ یونی ورسٹی میں پندرہ شعبے ہیں اور نو تحقیقی مرکز۔ طلبہ کی تعداد بائیس ہزار ہے۔ دراصل یہ یونی ورسٹی کئی عمارتوں میں بکھری ہوئی ہے اور عمارتیں ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر ہیں۔ چنانچہ اب لینن گراڈ سے باہر یونی ورسٹی کا نیا کیمپس زیرِ تعمیر ہے۔

اس سے ذرا آگے پرانے نوادر پر مشتمل ایک عجائب گھر تھا جس کا نام ہے "ایوانِ نوادر" (Chamber of Curiosities) قریب ہی دسمبر اسکوائر ۱۸۲۵ء کی بغاوت کی یاد دلا رہا تھا۔ سامنے پیٹر اعظم کا مجسمہ تھا۔ گھوڑے پر سوار۔ دائیں ہاتھ دریا پر ڈیزل سے چلنے والی کشتیاں اور جہاز ماحول کے حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔

قریب ہی ایک چرچ تھا۔ بہت عالی شان، جس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ چالیس سال میں مکمل ہوا تھا۔ آگے بڑھے تو کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کی عظیم عمارت نظر آئی جس کے صدر دروازے پر ہر آدھے منٹ کے بعد وقت اور ٹمپریچر باری باری آ جا رہے تھے۔

وہ عمارت بھی دیکھی جہاں ۱۹۰۵ء کا انقلاب شروع ہوا تھا۔ اس سے چار قدم پر پشکن کا گھر تھا جہاں وہ زندگی بھر رہا اور پھر قتل ہوا۔ اب یہ مکان بھی ایک عجائب گھر ہے جہاں پشکن کے استعمال کی چیزیں رکھی ہیں۔ قریب ہی پشکن کا مجسمہ نصب ہے۔

ذرا آگے بڑھے تو لینن گراڈ کی سب سے بڑی لائبریری نظر آئی۔ یہ لائبریری روس میں دوسرے نمبر پر ہے۔ پہلے نمبر پر یعنی سب سے بڑی لائبریری ماسکو میں ہے۔ لینن گراڈ کی مذکورہ لائبریری میں کتابوں کی تعداد دو کروڑ ہے۔

بعض محلات اور گرجے ایسے دکھائے جو اب آبادی یا کسی بازار کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان کی اگرچہ ماضی کی تاریخی یادگاروں کی طرح حفاظت کی جا رہی ہے لیکن ان کے آس پاس کی عمارتیں بھی ایسی ہیں کہ ان پر محلات کا گمان ہوتا ہے۔

لائبریری سے ذرا آگے الیگزینڈر سووروف ایوی نیو ہے۔ سووروف کتوزوف کا اُستاد تھا۔ یہ جرنیل ساٹھ جنگیں لڑا تھا اور ہر جنگ میں فتح یاب ہوا تھا۔

آخر میں ہم لوگ ایک قبرستان میں پہنچے جہاں شروع ہی میں ایک نہ بجھنے والا شعلہ روشن ہے۔ یہ قبرستان دوسری جنگِ عظیم کی یادگار ہے۔ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں لینن گراڈ کے پانچ لاکھ افراد نازی فوج کے حملوں سے اور پانچ لاکھ بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کے ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ قبرستان تاریخِ روس کے اسی واقعے کی یادگار ہے۔ اس کا نام ہے پیسکارا فسکی قبرستان۔ یہاں قبروں کی لمبائی چوڑائی بہت زیادہ ہے اور ایک ایک قبر میں متعدد لاشیں دفن ہیں۔ مرنے والوں میں فوجی سپاہی، افسر اور جرنیل بھی ہیں اور عام لوگ بھی۔ ہر قبر کے آگے ایک پتھر نصب ہے جس پر ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء لکھا ہے۔ اگر مرنے والے فوجی ہیں

تو پتھر پر ستارہ بنا ہے اور اگر شہری ہیں تو پتھر پر درانتی اور ہتھوڑے کا نشان ہے۔

اس قبرستان میں گلاب کے تختے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ گلاب کے یہ پھول پولینڈ نے تحفتاً روس کو دیے تھے۔ سامنے جہاں قبرستان ختم ہو رہا ہے مادرِ روس کا مجسمہ ہے جس کی نظروں کے سامنے اس کے بچوں کی تربتیں ہیں۔

یہاں دن بھر ماتمی موسیقی کی دھنیں بجتی رہتی ہیں۔ کوئی سنگ دل سیاح ہی ہوگا جو اس سارے منظر سے متاثر ہوئے بغیر واپس آجائے۔

مدت ہوئی میرے والد محترم نے ایک نظم "وادیٔ غم" کے عنوان سے کہی تھی۔ جب میں اس قبرستان کی ماتمی فضا میں الیگزینڈر اور اولگا کے ساتھ قبروں کے ایک لامتناہی سلسلے کو دیکھ رہا تھا تو نہ جانے مجھے والد محترم کی اس مذکورہ نظم کے مندرجہ ذیل اشعار کیوں یاد آگئے۔ کیا وہ عالمِ تصور میں ایسے ہی ماحول کا مشاہدہ کر چکے تھے؟ بہرطور وہ اشعار یہ ہیں۔

خامشی چھائی ہوئی ہے دامنِ کہسار میں
دم بخود بیٹھی ہے حیرت سایۂ اشجار میں

سرنگوں کوہ و شجر کی سرفرازی ہے یہاں
شام کے سایوں میں گیسو کی درازی ہے یہاں

طائروں کو اس جگہ گانے کی عادت ہی نہیں
ندیوں کو شور کرنے کی اجازت ہی نہیں

پرتوِ خورشید کے منہ پر نقابِ سایہ ہے
صبح کا ملبوس ہے جو شام کا پیرایہ ہے

سبزہ و گل پر یہاں ہر چند آتی ہے بہار
ہر برس آتی ہے یوں گویا کہ جاتی ہے بہار

پھر نہیں سکتی یہاں آوارہ راہوں میں نسیم
رہتی ہے گم گشتہ اپنے دل کی آہوں میں نسیم

رنگ و بوئے گل میں اصلا شوخی و تیزی نہیں
فصلِ گل میں دلکشی ہے پر جنوں خیزی نہیں

چاندنی راتوں میں میلی ہے ردائے ماہتاب
چپکے چپکے جا رہا ہے سر جھکائے ماہتاب

بسکہ رقت آفریں ہے رات کا منظر یہاں
چشمِ پرنم کا گماں ہوتا ہے تاروں پر یہاں

اک سکوتِ دائمی ہر شے پہ ہے چھایا ہوا
رقتِ بیداکیش سے ہے ہر پھول مرجھایا ہوا

سبزۂ دامن کشاں چاروں طرف خوابیدہ سا
ہر شجر حیرت زدہ، دل گیر سا، غم دیدہ سا

وقت ہوتا ہے رواں آہستہ آہستہ یہاں
چلتی ہے بادِ وزاں آہستہ آہستہ یہاں

حسن اپنی شوخیوں سے اس جگہ بیگانہ ہے
بے خبر رنگِ بیاں سے عشق کا افسانہ ہے

رات کو نو بجے کے قریب آسمان پر بادل گھر آئے اور رات بھر بارش ہوتی رہی۔ مجھے چوں کہ ایرکنڈیشنڈ کمروں میں سونے کی عادت نہیں ہے۔ اس لیے میں نے روشن دان تھوڑا سا کھول دیا۔ اس سے بارش کی دل کش موسیقی اس وقت تک سنائی دیتی رہی جب تک میں سو نہ گیا۔

▲

۱۵

لینن گراڈ یونی ورسٹی

صبح کو جاگا تو بھی بارش ہو رہی تھی۔ الیگزینڈر کو فون کیا۔ پتا چلا یونی ورسٹی میں پروگرام گیارہ بجے ہے۔ تیار ہو کے ساڑھے دس بجے نیچے اترے اور گیارہ بجے تک یونی ورسٹی جا پہنچے۔ یہاں ہماری منزلِ مقصود انڈین فائلالوجی کا شعبہ تھا۔ سب سے پہلے سنسکرت کے لیکچرر روی ارمین سے ملاقات ہوئی۔ بنگالی بھی یہی پڑھاتے ہیں۔ ان کی کلاس میں تین طالبات تھیں جو بنگالی پڑھ رہی تھیں۔ دیواروں پر گاندھی، ٹیگور، اور پریم چند کی تصویریں آویزاں تھیں۔ ہندستان کا ایک نقشہ بھی تھا جو ہندی میں تھا۔

وہاں سے اسی شعبے کے ایک اور کمرے میں آئے جہاں میرا لیکچر ہونا تھا۔ یہاں پروفیسر ٹی۔ ای۔ کیتھینانے السلام علیکم کہہ کے میرا استقبال کیا۔ میں نے جواب میں وعلیکم السلام کہا۔ میرا خیال تھا کہ عربی پڑھاتی ہوں گی لیکن پتا چلا کہ اردو، ہندی، سنسکرت اور مراٹھی پڑھاتی ہیں۔ میں نے یہاں انھی کی صدارت میں

Ghalib As A Prose-writer

(غالب بحیثیت نثر نگار) کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ مقالے کے خاتمے پر کیتھینانے حاضرین کو بتایا کہ یہ بالکل ہی پشکن کا سا معاملہ ہے۔ پشکن کی بھی نثر پر اس کی شاعری حاوی ہو گئی ہے اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پشکن ایک اعلا پایے کا نثر نگار بھی تھا۔

مقالے کے بعد کلام کی فرمائش ہوئی۔ میں نے اپنی تازہ ترین نظم "لیٹیا میں ایک دن" جو ایک رات قبل ہی کہی تھی پڑھی۔ نظم پڑھنے کے بعد میں نے اس کا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔

تین بجے اورینٹل فیکلٹی کی اکیڈیمی آف سائنسز میں جانے کا پروگرام تھا۔ اورینٹل فیکلٹی کے، ماسکو میں بھی، ریگا میں بھی اور یہاں بھی، دو حصے ہیں۔ وہ شعبہ جس میں طلبہ کو ان زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اکیڈیمی آف آرٹس کہلاتا ہے، اور جس شعبے میں تحقیق، ترجمے اور ترتیبِ متن کا کام انجام پاتا ہے اکیڈیمی آف سائنسز کہلاتا ہے۔ غالباً روس کی ہر یونی ورسٹی میں ایسا ہی ہوگا۔ مجھے یہ بات پسند آئی کہ تحقیق، ترجمے اور ترتیبِ متن کے کام کو درس و تدریس سے علاحدہ رکھا گیا ہے۔

یہاں پروفیسر زوگراف سے ملاقات ہوئی جو اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی اور ڈوگری بخوبی جانتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ غیر ملکی زبانوں میں سے اردو ان کی محبوب ترین زبان ہے۔ انھوں نے اردو میں پی ایچ ڈی بھی کی ہے اور ان کے تھیسس کا عنوان تھا "انیسویں صدی کے شروع میں اردو نثر"۔ میرامن کی "باغ و بہار" کا انھوں نے روسی میں ترجمہ کیا ہے جس کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ایک ۱۹۵۷ء میں چھپا دوسرا ۱۹۶۲ء میں۔ "امراؤ جان ادا" کا بھی آپ نے روسی میں ترجمہ کیا ہے۔ زوگراف نے بتایا کہ خوشونت سنگھ کا انگریزی ترجمہ "امراؤ جان ادا" کا بہت بعد میں چھپا۔

"اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی کے ابتدائی دور کی ہندوستانی" ان کی روسی میں ایک تصنیف ہے۔ ایک اور کتاب کا نام ہے

REFERENCE BOOK ON THE LANGUAGES OF INDIA, PAKISTAN CEYLONE AND NEPAL

پانچ برس کی لگاتار محنت سے انھوں نے ہندی روسی ڈکشنری مرتب کی جو ضخیم جلدوں میں ۱۹۷۲ء میں چھپی ان کی جدید ترین کتاب A COMPARATIVE STUDY OF INDO-ARYAN LANGUAGES ہے جو ۱۹۷۶ء میں چھپی اور جس میں انھوں نے ان زبانوں کی آپس میں مماثلت اور عدم مماثلت پر روشنی ڈالی ہے۔

زوگراف نے بتایا کہ کرشن چندر کی کہانیوں کے چار مجموعوں کا اور ایک ناول "شکست" کا روسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

دراصل اپنے کاموں کے بارے میں پروفیسر زوگراف نے بہت بعد میں بتایا، جب میں نے اصرار کیا۔ پہلے تو وہ اکیڈیمی آف سائنسز کے کاموں اور اپنے رفقائے کار کے متعلق بتاتے رہے۔ اکیڈیمی کے متعلق انھوں نے بتایا کہ اکیڈیمی کا کام زیادہ تر ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ اور زمانۂ قدیم کی تہذیب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت جو سب سے اہم کام اکیڈیمی کے ہاتھ میں ہے، وہ مہا بھارت کا روسی ترجمہ ہے جس کی ابتداء دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہوئی اور جس کی اس وقت تک پہلی، دوسری، چوتھی اور پانچویں جلد چھپ چکی ہے۔ تیسری جلد چھپ رہی ہے۔

ڈاکٹر دوبسلکو ہندستانی رزمیہ کی تاریخ اور شعریات پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ قدیم ہندستانی دیومالا ان کا موضوع ہے۔ ان کے تھیسس کا موضوع تھا "مہابھارت اور رزمیہ کی سینہ بہ سینہ روایت"۔

رامائن اور بھاگوت پران پر بھی کام ہو رہا ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر زوگراف نے ۵۷۶ صفحات پر مشتمل بڑی تقطیع کی ایک کتاب دکھائی جو ان تین ابواب پر مشتمل تھی:۔ رام کی کہانی، کرشن کی کہانی اور بھاگوت پران۔ کتاب پر تعدادِ اشاعت نوے ہزار لکھی تھی۔

کتابیں روس میں جس تعداد میں چھپتی ہیں وہ ہمارے لیے انتہائی حیرت و استعجاب کا باعث ہے۔ ابھی چند روز قبل جب میں تالستائی کی ایک سو پچاسویں سال گرہ کے سلسلے

میں یاسنا پالیانا میں تھا تو پتا چلا تھا کہ تالستائی کی تمام تصانیف بائیس مجموعوں کی صورت میں ایک ایک کروڑ کی تعداد میں چھپ رہی ہیں۔ ابھی یہ مجموعے مطبعے سے باہر نہیں آئے لیکن تمام جلدیں (۔۔ بائیس کروڑ کی تعداد میں ۔۔ فروخت ہو چکی ہیں۔ مجھے وہاں اکثر ملنے والوں نے بتایا کہ وہ یہ کتابیں خریدنا چاہتے ہیں لیکن کتابیں بازار میں آ ہی نہیں سکیں گی۔ خریدیں کیسے۔

پروفیسر زوگراف نے ڈاکٹر روڈوئی سے ملوایا جو بدھ فلسفے پر کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر روڈوئی بھی پروفیسر زوگراف کی طرح اردو بہت اچھی جانتے ہیں۔ آپ اس وقت بدھ دھرم کی کتاب "آدی دھرم کوش" پر کام کر رہے ہیں۔ "آدی دھرم کوش" کا تبتی اور چینی ترجمہ موجود تھا۔ اصل کتاب نایاب ہو گئی تھی لیکن اب جیسوال بدھسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ کی کوششوں سے دستیاب ہو گئی ہے۔ اسی نسخے کی ایک نقل ڈاکٹر روڈوئی کے پاس ہے۔

ڈاکٹر اندرے پری تک پالی زبان پر کام کر رہی ہیں اور پالی کی مشہور فلسفے کی کتاب "ملند پنہا" کا روسی میں ترجمہ کر رہی ہیں۔

"مہابھارت" کے بارے میں ایک بات میں بتانا بھول گیا کہ ڈاکٹر نیری لینا نے بھی "مہابھارت" پر مبنی دو کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کا نام ہے "قدیم ہندستانی رزمیوں میں دیومالائی تصورات" اور دوسری کا نام ہے "مہابھارت میں تشبیہیں اور استعارے"۔

اس اثنا میں سامنے کی میز سے ایک لڑکی اٹھی اور اس نے چائے بنا کے چار پیالیاں ہمارے سامنے رکھ دیں۔ الیگزینڈر بھی ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ ایک اور روسی ادیب بھی تھے اردو بہت اچھی بول رہے تھے۔ بدقسمتی سے ان کا نام میں بھول گیا ہوں۔ یہ پاکستان میں دو برس رہ چکے ہیں اور وہاں انٹرپریٹر کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ اس لڑکی کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر زوگراف نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر غفوروا ہیں اور کبیر کی شاعری پر کام کر رہی ہیں۔ انھوں نے کبیر کے ان دوہوں پر جو آدی گرو گرنتھ صاحب میں ہیں کتاب لکھی ہے اور اس وقت یہ کبیر کے متعلق اُن حوالوں پر کام کر رہی ہیں جو اردو تذکروں میں آئے ہیں۔

غفوروا کے نام پر میں چونکا اور کہا کہ قریب قریب اسی نام کے ایک روسی ادیب کو میں جانتا ہوں۔ بلکہ وہ میرے دوست تھے۔ مرحوم بابا جان غفوروف ہر نوروز پر وہ مجھے نئے سال کا کارڈ بھیجتے تھے۔ دہلی میں اُن سے میری ملاقات بھی ہو چکی ہے۔ زوگراف بولے یہ انھی کی بیٹی ہیں۔ میں دوبارہ کھڑا ہوا اور پہلے سے کہیں زیادہ احترام کے ساتھ ان سے ملا۔ میں نے کہا کہ ہندستان میں شاید ہی کوئی مصنف یا اہلِ قلم ایسا ہو جو بابا جان غفوروف کے نام سے آشنا نہ ہو۔ بڑے ادیبوں کی اولاد سے مل کر بھی ایک ناقابلِ بیان مسرت ہوتی ہے۔ اس ملاقات کے ساتھ ہی مجھے لاہور میں جاوید اور منیرہ سے ملاقات یاد آگئی اور بالخصوص جب اولاد خود اونچے پائے کی اہلِ قلم ہو تو کیا ہی کہنا۔ جاوید اقبال اور غفوروا اسی بلند پایہ اہلِ قلم اولاد کے ذیل میں آتے ہیں۔

ایک اور اہلِ قلم جو اسی ادارے میں کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کرنیشوو ہیں جو مراٹھی

کے عالم ہیں اور روسی میں مراٹھی اسماء پر ایک کتاب لکھ چکے ہیں۔ ان کی دوسری کتاب "مراٹھی ادب کی تاریخ" ہے۔ اس وقت مراٹھی مصنف گیان دیو کی کتاب "گیانیشوری" کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر زوگراف نے بتایا کہ یہ کتاب بھگوت گیتا کا مراٹھی روپ ہے۔

مس چزی کووا بنگالی زبان اور ادب پر کام کر رہی ہیں۔ بنگالی زبان پر کتابیات کے متعلق روسی میں ایک کتاب شائع کر چکی ہیں۔ ایک کتاب ان کی بنگالی گرامر کے متعلق بھی شائع ہو چکی ہے۔

رام، کرشن اور بھاگوت پران کے متعلق ایک کتاب کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ یہ کتاب ڈاکٹر چامکن اور پروفیسر ارمین کی مشترکہ تالیف ہے۔ ڈاکٹر چامکن ایک کتاب ہندستانی دیومالا پر لکھ چکے ہیں۔ اس کا عنوان ہے "قدیم ہندوستانی دیومالا"۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ یونی ورسٹی کی اردو کی استانی تاسیانا جن کے ساتھ ایک دن قبل سوویٹ رائٹرز یونین کے دفتر میں میری ملاقات ہو چکی تھی اردو کے ایک طالب علم اور ایک طالبہ کو لے کے وہاں آ پہنچیں۔ طالب علم نے اپنا نام دمیتری بتایا اور طالبہ نے ایرینا۔ دمیتری اُردو صحافت پر کام کر رہا تھا۔ اس کے مقالے کا موضوع تھا "انگریزی صحافت کا اثر اردو صحافت پر" اور ایرینا کا موضوع تھا۔ اقبال زندگی اور شاعری"۔ میری کتاب "اقبال اور اس کا عہد" تاسیانا تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے ایرینا سے کہا اقبال پر میری کتابوں میں سے ایک کا عنوان ہے "اقبال زندگی، شخصیت اور شاعری"۔ میں یہ کتاب تمھیں بھیجوں گا۔ شاید یہ تمھارے کام کی ہو۔

اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے پروفیسر زوگراف اور دوسرے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا اور اجازت طلب ہوا۔

تاسیانا، ایرینا اور دمیتری مجھے باہر گاڑی تک پہنچانے آئے۔ میں گاڑی میں بیٹھا تو انھوں نے ہندستانی طریقے سے مجھے نمستے کہہ کے الوداع کہی۔

ہوٹل پہنچ کے میں نے سامان سمیٹا کیوں کہ رات کی گاڑی سے واپس ماسکو روانہ ہونا تھا۔

▲

۱۶

پھر ماسکو میں

اب کے پھر ریزرویشن فرسٹ کلاس میں تھا۔ گویا خواہش کے باوجود تھرڈ کلاس کو دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ غالباً میں نے جن ریلوں میں سفر کیا ان میں تھرڈ کلاس تھا ہی نہیں۔ صبح کو آنکھ کھلی تو ریل ہرے بھرے میدانوں میں سے گزر رہی تھی۔ ماسکو قریب تھا۔ میں تیار ہو کے بیٹھا ہی تھا کہ کنڈکٹر گارڈ نے چائے کی ایک پیالی لا کے دی۔ پھر اس نے مجھ سے روسی میں کچھ پوچھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ کیا کہہ رہی ہے۔ شاید بسکٹ وغیرہ کے لیے پوچھ رہی ہو۔ الیگزینڈر سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ کنڈکٹر سے "سپاسیبا" یعنی "شکریہ" کہہ دیا۔

ماسکو میں قیام پھر اسی ہوٹل میں تھا۔ اب کے میرا کمرہ ساؤتھ ونگ میں تھا۔ نہانے کے بعد سوچا۔ اپنے پہلے کمرے کو جا کے دیکھنا چاہیے۔ وہ ایسٹرن ونگ کا ایک کمرہ تھا۔ ایسٹرن ونگ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں تھک گیا۔ بہ یک وقت چھ ہزار سیاحوں کے رہنے کا ہوٹل — اور دنیا کا سب سے بڑا ہوٹل — گویا پورا ایک شہر آباد ہے۔ بڑی مشکل سے کمرہ ملا۔ میڈ نے پہچان لیا۔ روسی میں گویا ہوئی۔ میں بت بنا کھڑا رہا۔ جس ملک میں انسان ہو اس کی زبان نہ جاننا بھی ایک عذاب ہے۔ وہاں سے اپنے نئے کمرے میں واپس آنا پھر ایک دشوار منزل تھی۔ کوئی بیس پچیس منٹ میں یہ منزل طے ہوئی۔

ایک چکر ہندستانی سفارت خانے کا لگایا۔ سفارت خانہ بند تھا۔ ہفتے اور اتوار کو یہاں چھٹی ہوتی ہے۔ ہندستان کے لیے کچھ خطوط ریپشنسٹ کے حوالے کیے۔ ناروے سے آیا ہوا خط جو رام لعل کا ہوگا یا ہرچرن چاولہ کا نہ ملا۔ چھٹی نہ ہوتی تو شاید مل جاتا۔ میں دوسرے دن (اتوار کو) دوشنبہ (تاجکستان) جا رہا تھا۔ گویا اب ۱۴ ستمبر تک اس خط کے ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

ابھی تک حبیب الرحمٰن اور تقی حیدر سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ تقی حیدر سے تو ایک بار ٹیلی فون پر بات کرنے کی کوشش بھی ناکام ہو چکی تھی۔ چنانچہ ہندستانی سفارت خانے سے واپس آتے ہی تقی حیدر کو ٹیلی فون کیا۔ وہ مل گئے۔ بہت خوش ہوئے۔

میں نے بتایا کہ میں نے تو کئی بار ٹیلی فون کیا لیکن آپ نہ ملے۔ دراصل ٹیلی فون کے معاملے میں مجھے یہ نہیں پتا چلتا تھا کہ گھنٹی بج رہی ہے یا ٹیلی فون مصروف ہے یا خراب ہے۔

انھوں نے پروگرام پوچھا۔ میں نے کہا آج اور کل دو دن ماسکو میں ہوں اور کوئی خاص پروگرام بھی سامنے نہیں۔ یہ دو دن ہفتہ اور اتوار کے ہیں۔ اور ہاں شاید کل شام دوشنبہ جا رہا ہوں۔ بولے آج شام کو تو میں ایک جگہ کھانے پر مدعو ہوں۔ کل شام کو آپ جا رہے ہیں تو کل دن کا پروگرام میرے ساتھ رکھیے۔ میں کوئی دس بجے آ کے آپ کو لے جاؤں گا۔ دن میں کھانا ساتھ کھائیں گے۔ گپ شپ رہے گی۔ میں دو ایک اور احباب کو بھی بلا لوں گا۔

چنانچہ وہ اگلے دن صبح دس بجے آ کے مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کا مکان شہر سے بہت دور ایک پر فضا جگہ پر واقع ہے۔ یہاں نہ آسمان کو چھونے والی عمارتیں ہیں نہ سڑکوں پر ٹریفک کی بھرمار۔ پرسکون فضا میں پہنچتے ہی دل و دماغ نے ایک عجیب فرحت اور تازگی محسوس کی۔ ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ حبیب الرحمٰن بھی آ گئے یا در تقی حیدر کے دو اور دوست شکلا اور یوگیندر پال بھی۔ حبیب الرحمٰن کے ساتھ میری پرانی ذاتی نکلی۔ یہ محفل بہت پر لطف رہی اور میں شام کے چھے بجے تک وہاں رہا۔ اس دن ایک بار پھر گویا ماسکو میں محفل احباب نے ایک چھوٹا سا ہندستان بنا لیا۔

ہاں تو میں ایک دن پہلے کا ذکر کر رہا تھا۔ اچانک خیال آیا کہ سجاد حیدر صاحب یہاں پاکستان کے سفیر ہیں۔ ایک زمانے میں وہ دہلی میں غالباً ہائی کمشنر رہ چکے تھے۔ ان کے ساتھ پرانی السلام علیکم تھی۔ انھیں ٹیلی فون کیا۔ بڑے اخلاق اور محبت سے پیش آئے۔ انھوں نے بھی میرا پروگرام پوچھا۔ میں نے بتایا کہ کل کا دن تو تقی حیدر اور حبیب الرحمٰن کے ساتھ بسر ہوگا اور شام کو شاید دوشنبہ چلا جاؤں گا۔ انھوں نے دوشنبہ سے واپسی پر اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ میں نے کہا کہ دوشنبہ سے واپسی پر میں آپ کو ٹیلی فون کروں گا۔ امید ہے کہ دہلی جانے سے قبل پھر ماسکو میں دو ایک دن قیام ہوگا۔ اس وقت میں حاضر ہوں گا۔

ابھی میں تقی حیدر کے یہاں ہی بیٹھا تھا کہ پتا چلا دوشنبہ کی ریزرویشن اُس دن شام کے طیارے سے نہیں بلکہ اگلی صبح کے طیارے سے ہوئی ہے۔ جب تک تقی حیدر سے ٹیلی فون پر بات نہیں ہوئی تھی۔ یہی خیال تھا کہ چھٹی ہونے کے باعث یہ دن ماسکو میں ضائع ہو رہا ہے لیکن تقی حیدر کے یہاں جو محفل جمی صبح کے دس بجے سے شام کے چھے بجے تک تو میرا دل خوشی سے لبریز ہو گیا اور میں یہ اطمینان بخش احساس لے کے وہاں سے رخصت ہوا کہ اس دن کا اس سے بہتر مصرف اور ہو ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

▲

(۱۷)

ماسکو سے دوشنبہ

اس رات نہ جانے کیا ہوا نیند قطعی نہیں آئی۔ صبح سات بجے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ آخر اٹھ بیٹھا اور نو بجے تیار ہو کے الیگزینڈر کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں وہ آ گئے اور ہم طیارہ گاہ کو روانہ ہو گئے۔ رات کو جاگنے کے باعث طبیعت بھاری تھی۔ ہوٹل رسیا سے ماسکو ایرپورٹ تک ایک گھنٹے کا سفر ہے۔ گاڑی میں جھپکی آ گئی۔ اور طبیعت بحال ہو گئی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ میں دو یا تین منٹ سے زیادہ نہیں سویا۔ لیکن شاید وہ دو تین منٹ کی نیند خاصی گہری تھی۔

طیارہ گاہ پہنچے تو پروفیسر ادماشنکر جوشی سے ملاقات ہو گئی۔ جوشی جی طلس جا رہے تھے۔ پتا چلا کہ ایک دن قبل وہ بھی رسیا ہوٹل میں تھے اور سارا دن کمرے ہی پر رہے کیوں کہ باہر کا کوئی پروگرام ان کا نہیں تھا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اگر پتا ہوتا کہ جوشی جی بھی لینن گراڈ سے واپس آ گئے ہیں اور رسیا ہوٹل ہی میں مقیم ہیں۔ تو میں ان کو اپنے ساتھ تقی حیدر کے وہاں لے جاتا۔ وہاں جا کے جوشی جی بھی بہت خوش ہوتے اور تقی حیدر اور ان کے احباب بھی۔

تھوڑی دیر میں ہمارے طیارے کی روانگی کا اعلان ہوا اور ہم لوگ پروفیسر جوشی اور تانیا سے اجازت لے کے اپنے طیارے کی طرف چلے۔ ایرپورٹ طیاروں سے معمور تھا۔ اگر بس ہمیں وہاں تک نہ لے جاتی تو طیارے تک تنہا میرا پہنچنا ناممکن تھا۔

ماسکو سے دوشنبہ تک چار گھنٹے کا سفر تھا۔ چار بجے وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ دوشنبہ کا وقت ماسکو سے تین گھنٹے آگے ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنی اپنی گھڑیوں کو تین گھنٹے آگے کیا یعنی ان پر سات بجا دیے اور کوئی آدھ گھنٹے میں سورج غروب ہو گیا۔ گویا یہ دن خلاف توقع بہت ہی مختصر نکلا۔ جب دہلی سے ماسکو آیا تھا تو گھڑی ڈھائی گھنٹے پیچھے کرنا پڑی تھی دن کا کھانا طیارے میں کھانے کے بعد جب ماسکو پہنچا تھا تو ایک گھنٹے کے بعد پھر ایک بجا۔ گویا پھر دن کے کھانے کا وقت آ گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے لیے دوبارہ کھانا ممکن نہیں تھا۔

طیارے سے اترے تو ایک صاحب نے بڑے یقین کے ساتھ مجھے "آزاد" کہہ کے پکارا اور مصافحہ کیا۔ نہ جانے انھوں نے تین سو مسافروں میں سے ایک پر کیسے آزاد کا گمان کر لیا — شاید اس لیے کہ بند گلے کا کوٹ صرف میں ہی پہنے ہوئے تھا۔ اور وہ گمان صحیح نکلا۔ میں نے اُن سے ان کا اسم گرامی پوچھا۔ انھوں نے عبدالستار بتایا اور ہندستانی فارسی میں بات شروع کی۔ میں نے بھی اپنی فارسی کی شُد بُد کا سہارا لیا۔ طیارہ گاہ سے باہر نکلتے نکلتے میرا حوصلہ خاصا بڑھ چکا تھا اور ہم دونوں فارسی میں بات کرتے چلے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے میری فارسی کہیں صحیح ہوگی کہیں غلط۔ کیوں کہ فارسی بولنے کی مشق مجھے نہیں ہے۔ میں کئی مقامات پر اٹکتا بھی تھا۔ مثلاً جب انھوں نے مجھے دوشنبہ کی آبادی "چہار و نصف ملیون" کہہ کے بتائی اور مجھ سے دہلی کی آبادی پوچھی تو مجھے پینسٹھ لاکھ کو "شصت و نصف ملیون" کہنے میں خاصی دیر لگی۔

ہوائی جہاز سے اترتے ہی موسم کی شدید تبدیلی کا احساس ہوا۔ جموں کی سی گرمی اور جموں ہی کا سا ماحول نظر آیا۔ ایرپورٹ پر دور دور تک سوکھی گھاس اگی ہوئی تھی۔

انھی اشجار کے پیچھے کہیں شاید مرا گھر ہے
وہی جموں کی گرمی ہے وہی جموں کا منظر ہے

گرمی اور مناظر کی بات دوسری ہے ویسے یہ جموں نہیں تھا۔

اہل تاجکستان اپنی زبان کو فارسی نہیں کہتے۔ تاجیک کہتے ہیں لیکن میرے لیے یہ فارسی ہی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ عبدالستار تیز نہیں بول رہے تھے۔ میں نے پہلے یہ سمجھا کہ میرے لیے آسانی پیدا کرنے کی خاطر وہ بات چیت میں تیز روی سے کام نہیں لے رہے ہیں لیکن بعد میں پتا چلا کہ اہل تاجکستان کے بات کرنے کا طریقہ یہی ہے۔ گویا ہندستان اور پاکستان کے وہ لوگ جو میری طرح فارسی کے امتحانات پاس کر چکے ہیں لیکن جنھیں ایران جا کے اپنی فارسی کو مانجھنے کا موقع نہیں ملا بڑے مزے سے کسی ترجمان کے بغیر یہاں رہ سکتے ہیں اور بخوبی کام چلا سکتے ہیں۔

چوں کہ روس میں مذہب اختیار کرنے پر اور مذہب کے حق میں یا مذہب کے خلاف اظہارِ خیال کرنے پر کوئی پابندی نہیں اور ان علاقوں میں مسلمان خاصی تعداد میں ہیں تو احتیاطاً میں نے عبدالستار سے پوچھا کہ آپ مسلمان ہیں نا؟ انھوں نے کہا "جی ہاں ہیں مسلمان ہوں۔" پھر بولے مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہوں اس لیے مسلمان ہوں، ویسے مسلمانوں والی کوئی بات تو مجھ میں ہے نہیں۔ پھر مجھ سے پوچھا آپ کا نام ہندوؤں کا سا بھی ہے اور مسلمانوں کا سا بھی۔ آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟ میں نے کہا "آقائے عبدالستار، میری حالت بھی آپ اپنی طرح ہی سمجھ لیں۔ میں بھی ہندو گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے ہندو ہوں۔ مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے کی توفیق تو کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح باتیں کرتے کرتے ہم ہوٹل تک پہنچ گئے۔ اس ہوٹل کا نام ہوٹل تاجکستان تھا۔ رستے میں انھوں نے مجھے لینن کے مجسمے کے علاوہ مشہور شاعر صدرالدین عینی کا مجسمہ دکھایا جس کی سوویں سال گرہ پچھلے دنوں سارے تاجکستان میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔

ہوٹل میں جب آ کے ٹک گئے تو عبدالستار نے دو دن کا پروگرام تاجیک یعنی فارسی میں پڑھ کے سنایا۔ میں نے کہا "خیلے خوب است" بولے "معقول است" میں نے بھی جواب میں "معقول است" کہا۔ اس پر وہ اجازت طلب ہوئے اور چلتے چلتے کہنے لگے کہ آپ کے متعلق ہمیں پہلے ہی سے معلوم تھا کہ آپ فارسی بہت اچھی جانتے ہیں اور فارسی میں شعر بھی کہتے ہیں۔ میں نے کہا بہت اچھی تو کیا جانتا ہوں۔ یہی ٹوٹی پھوٹی جانتا ہوں جو بول رہا ہوں۔ اب رہی شعر کی بات تو فارسی میں شعر کہتا ضرور ہوں لیکن ان اشعار کی اہل زبان کے نزدیک کوئی وقعت ہے یا نہیں اس سے میں بے خبر ہوں۔ پھر ان کی فرمائش پر میں نے اپنے دو ایک اشعار فارسی کے انھیں سنائے۔ انھوں نے ہر بار مصرع دہرایا اور "خیلے بلند" اور "خیلے نازک" کہا۔ مجھے اتنا حوصلہ ہو گیا کہ اگر کل اور پرسوں کے جلسوں میں کہیں فارسی کلام سنانا پڑا تو کام چل جائے گا۔

اب میری دانش مندی کی بات یہ ہے کہ میں تاجکستان جا رہا تھا اور اپنے فارسی کلام کی بیاض ساتھ لے جانا بھول گیا تھا۔ چنانچہ سوچا کہ رات کو سونے سے قبل اپنے پرانے فارسی اشعار حافظے کی مدد سے کاغذ پر لکھ لوں گا لیکن ہوا یوں کہ اس رات پہلے تو دیر تک پڑھتا رہا پھر ایک رات پہلے جاگنے کے باعث تھکن نے غلبہ پانا شروع کیا۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہ آئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گھڑی دیکھتا رہا۔ گیارہ، بارہ، ایک اور پھر اسی طرح صبح کے چار اور پھر پانچ بج گئے۔ دس بجے شہر کے مناظر اور قابل دید مقامات دیکھنے کے لیے نکلنا تھا۔ طبیعت بہت پریشان ہوئی۔ آخر شاید پانچ بجے آنکھ لگ گئی لیکن صرف دو گھنٹے کے لیے۔ سات بجے میں پھر جاگ گیا اور نہا دھو کے تیار ہو گیا۔

▲

(۱۸)

دوشنبہ کی ایک جھلک

کسل مندی کے باعث ناشتہ کوئی ساڑھے نو دس بجے کیا۔ یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور دلی مسرت بھی کہ ناشتے کی میز پر ایک خوب صورت اسٹینڈ پر ریشمی کپڑے کا بنا ہوا ترنگا لہرا رہا ہے۔ یہ ہندستان سے آئے ہوئے مہمان کی عزت افزائی کی خاطر تھا۔

اس وقت تک عبدالستار بھی پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنا مزید تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ تاجکستان رائٹرز یونین میں صدر شعبۂ نثر ہیں اور اس حیثیت میں ان کی زیر نگرانی صدائے مشرق کے نام سے ایک تاجیک جریدہ شائع ہوتا ہے۔ ان کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ تاجیک فلمز کے Editing Commission کے رکن ہیں۔ غالباً یہ وہی عہدہ ہوگا جو ہمارے یہاں فلم سنسر بورڈ کے رکن کا ہوتا ہے۔

ناشتے کے بعد ہم لوگ ہوٹل سے نکلے۔ اس شہر کی سیاحت کی ابتدا بھی لینن ایوی نیو سے ہوئی اور ہم اوپرا اور بیلے تھیٹر، کلاسیکی آرٹ گیلری، فردوسی لائبریری، مایاکاوسکی تھیٹر، کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے دفتر، سیاسی تعلیم کے عوامی اسکول، انڈسٹریل انسٹی ٹیوٹ اور زراعتی کالج سے ہوتے ہوئے رودکی کے مجسمے تک جا پہنچے۔ رودکی یہاں سے ۲۲۰ کلومیٹر دور پنج رود نامی ایک مقام پر پیدا ہوا تھا۔ رودکی کے مجسمے کے نیچے پتھر پر رودکی ہی کا یہ شعر کندہ تھا۔

ہر کہ بے محنت گزشت از روزگار
ہیچ ناموزد ز ہیچ آموزگار

وہاں سے آگے چلے تو سامنے سے چار ریش دراز مولوی صاحبان آتے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ لوگ تہمد باندھے تھے۔ عبدالستار نے بتایا کہ یہ بنگلہ دیش کے لوگ ہیں۔ میں السلام علیکم کہہ کے ان سے مخاطب ہوا۔ انھوں نے بڑی فصیح اردو میں میرے ساتھ بات چیت کی۔ میں نے اپنا نام اور پتا بتایا۔ انھوں نے میرا کارڈ مجھ سے لیا اور اپنے نام منیر احمد، محمد حبیب اللہ، محمد ادریس اور عبدالواحد بتائے۔ پتا چلا کہ اسی تاجکستان ہوٹل میں مقیم ہیں جہاں میں مقیم ہوں۔

یہ لوگ بات چیت کرکے رخصت ہوئے تو عبدالستار نے کہا "مردمانِ دین دار ہستند"۔ میں نے عبدالستار سے پوچھا "آغائے عبدالستار! شما ہم دیندار ہستید؟" بولے "نماز ہیچ، روزہ ہیچ، ولے کسے را فریب نمی دہم۔ دروغ نہ گوییم۔ شیوۂ من راست بازی است"۔ میں نے جواب میں کہا کہ میرے معیار سے تو آپ بھی دین دار ہیں۔

گاڑی کوئی پانچ منٹ اور چلی ہوگی کہ ایک اور قبر ہمارے سامنے تھی۔ نیچے اتر کے قریب گئے۔ یہ بابا جان غفوروف کی قبر تھی۔ اوپر نیا نیا بنا ہوا ایک مجسمہ رکھا تھا جو ابھی تک نصب نہیں ہوا تھا۔ نیچے پتھر پر کچھ تراش خراش کا کام بھی ابھی باقی تھا۔ مجسمے کو دیکھ کے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ غالب صدی تقاریب کے موقعے پر دہلی میں بابا جان غفوروف کے ساتھ میری ملاقات ہوئی تھی۔ اُن کا انتقال چند ہی برس قبل ہوا جب میں سری نگر میں تھا۔ میں نے اقبال کی تاریخِ ولادت کے معاملے میں سب سے پہلے "ہماری زبان" علی گڑھ میں اُنھی کے ساتھ اپنے اختلافِ رائے کا اظہار کیا تھا۔ بڑے عالی ظرف انسان تھے۔ مجھے ہر سال روس سے نئے سال کی پہلی تاریخ کو سالِ نو کا کارڈ بھیجا کرتے تھے۔ آج میں ان کی قبر کے آگے خاموش کھڑا تھا۔ دستِ دعا اٹھائے ہوئے۔

دو چار دن قبل لینن گراڈ میں ان کی عالم بیٹی غفوروا سے ملاقات ہوئی تھی اور ہم دونوں کچھ دیر ان کی باتیں کرتے رہے تھے۔ اب اِس وقت سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ

ہنگامہ گرم ہستیِ ناپایدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسّم شرار کا

ذرا آگے چل کے صدرالدین عینی کا مقبرہ تھا۔ قبر پر ان کا مجسمہ نصب تھا۔ ساتھ ہی تین مجسمے اور تھے۔ سنگ تراش کے تخیل کا شاہکار جو صدرالدین عینی کے زمانے کی روداد سنا رہے تھے۔

صدرالدین عینی ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے تھے گویا قریب قریب علامہ اقبال کے ہم عمر تھے اور ہم عصر لیکن دونوں ایک دوسرے کے کمالات سے ناواقف رہے۔ دو ایک ماہ قبل ان کی پہلی صد سالہ سال گرہ منائی گئی تھی جس میں ہندستان سے علی سردار جعفری اور عصمت چغتائی نے شرکت کی تھی۔ عبدالستار ترسون زادہ نے بتایا کہ ہندستان کے سفیر کبیر اندر کمار گجرال بھی ان تقاریب میں شرکت کے لیے ماسکو سے تشریف لائے تھے اور انھوں نے اِس موقعے پر ایک تقریر بھی کی تھی۔

عبدالستار کی زبانی (جو اپنے آپ کو ستار ترسون کہتے تھے) معلوم ہوا کہ صدرالدین عینی شاعر، مصنف، نثر نگار، اہل قلم، زبان شناس، ادب شناس، تاریخ دان، اور موسیقی شناس تھے۔ اسی شام کو مجھے رائٹرز یونین کی طرف سے آغائے مومن قناعت، آغائے فاتح نیازی اور آغائے باقی رحیم زادہ نے اور کتابوں کے ساتھ صدرالدین عینی کے حالات

اور کلام کے متعلق ایک ضخیم کتاب عنایت کی جس کے سرورق پر لکھا ہے۔

کارنامۂ
استاد صدرالدین عینی
باکوشش و اہتمام
کمال ص. عینی
زیر نظر محمد عاصمی
رئیس فرہنگستان علوم جمہوری شوروی تاجکستان
نشریات "عرفان" شہر دوشنبہ ۱۹۷۸ء

یہ کتاب تاجیک (بخط روسی)، روسی، فارسی (بہ خطِ نستعلیق) اور انگریزی میں ہے اور استاد صدرالدین عینی کی دخترِ نیک اختر کمال ص عینی نے اسے مرتب کیا ہے۔

اگرچہ نظم یا نثر کے طویل اقتباسات پیش کرنا میرے اِس سفرنامے کے اسکوپ سے باہر ہیں لیکن محض تفننِ طبع کی خاطر استاد صدرالدین عینی کے چند اشعار دیکھیے اور ان کی طبعِ رسا کی داد دیجیے۔

ہمسایہ زہمسایہ بخود رنگ بگیرد ہر تار زتارِ دگر آہنگ بگیرد
آہنگ دوگونست، مخالف و موافق دانا نتواند کہ ہر آہنگ بگیرد
آہنگ مخالف رسد از سازِ عداوت ایں سازبہ کف شخصِ دژآہنگ بگیرد
آہنگ موافق رسد از تارِ محبت ایں حبل متیں صاحب فرہنگ بگیرد
مادوستی خلقِ جہاں پیشہ گرفتیم از ماست ہر آنکس کہ چنیں رنگ بگیرد

برنا شود از دوستی مردمِ عالم رسوا شد آں کس کہ رہِ جنگ بگیرد
خونریزی و درندگی اطوار سباع است انساں نتواند کہ چنیں ننگ بگیرد
بحر نیست جہاں ہر کہ باندازۂ ہمت زیں بحر گہر گیرد، یا سنگ بگیرد

استاد صدرالدین عینی کی قبر اور مجسمے کے چاروں جانب چنار اور سرو کے اشجار تھے۔ سامنے پہاڑ تھا اور منظر ایسا حسین تھا کہ یہاں سارا دن بسر کیا جا سکتا تھا۔

پہاڑ کے ذکر سے یاد آیا کہ دوشنبہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک شہر ہے۔ گویا ایک طرح سے وادی میں ہے۔ سری نگر کے مانند لیکن یہاں کے پہاڑ خشک اور بے آب و گیاہ ہیں۔

ہوٹل میں میرا کمرہ سب سے اوپر کی منزل پر تھا اور دو طرف کھلتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں طرف پہاڑ ہیں۔ طلوع کے وقت یہ پہاڑ بہت خوب صورت معلوم ہوتے تھے۔ رات کو ایک اور ہی منظر نظر آتا تھا جیسے سارے شہر میں چراغاں ہو رہا ہو۔

یہ ایک جملہ معترضہ درمیان میں آگیا ہے۔ میں شعرا اور مصنفین کی قبروں کی زیارت کا ذکر کر رہا تھا۔ صدرالدین عینی کی قبر سے چل کے ہم لوگ مرزا ترسون زادہ کی قبر پر آئے۔

مرزا ترسون زادہ دوشنبہ سے ۵۴ کلومیٹر کے فاصلے پر کراتوغ نامی ایک شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی گذشتہ ہی برس اُن کا انتقال ہوا ہے۔

اُن کی قبر بڑی سڑک سے بہت دور ایک غیر آباد مقام پر ہے۔ بڑی سڑک سے قبر تک ایک نئی سڑک تعمیر کی گئی ہے۔ قبر کے ہر طرف چنار اور سرو کے اشجار لگائے جا رہے ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا باغ بنے گا جہاں لوگ آ کے بیٹھیں گے۔ قبر کی زیارت کریں گے اور ساتھ ہی پکنک منائیں گے۔

یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں قبروں کی زیارت کر رہا تھا اور میرے رفقا میں فاتحہ پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔

یہاں سے ستار ترسون ہمیں ایک نمایش دکھانے لے چلے۔ اس کا نام تھا "نمایش ترقی اقتصادی۔" کوئی ایک گھنٹہ یہ نمایش دیکھنے میں صرف ہوا اور تاجکستان کی اقتصادی ترقی کی ایک بہت خوب صورت تصویر نظر کے سامنے آگئی۔

▲

(۱۹)

سوویٹ رائٹرز یونین تاجکستان

ایک بجے سوویٹ رائٹرز یونین تاجکستان کی طرف سے کھانے کی دعوت تھی۔ وہاں پہنچے۔ اکثر شعرا اور اُدبا آچکے تھے۔ بعض بعد میں آئے۔ آقائے مومن قناعت جن کا ذکر دو ایک مصنفین کے ساتھ پہلے آچکا ہے بڑے تپاک سے ملے آپ "اتحادِ نویسندگان" کے صدر ہیں۔ تاجیک کے نامور شاعر ہیں۔ ان کے علاوہ جن حضرات سے وہاں ملاقات ہوئی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

آقائے عبید رجب۔ تاجکستان کے معروف شاعر ہیں۔ مجلّہ "صدائے مشرق" کے مدیر ہیں۔

آقائے فضل دین محمد یونِف اعلا پایے کے نثر نگار ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ بیدل کے بعد تاجکستان میں اقبال کی شہرت ہے اور اقبال کے بعد غالب کی اور یہ تینوں شاعر یہاں بہت مقبول ہیں۔ اقبال کی تمام فارسی کتابیں یہاں چھپ چکی ہیں لیکن روسی رسم الخط میں۔

آقائے عبداللہ جان غفارف۔ آپ کا بھی بلند پایہ نثر نگاروں اور شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔

آقائے باقر رحیم زادہ۔ تاجیک کے مشہور و معروف شاعر ہیں۔

آقائے امین جان شکوہی۔ ان کا تعارف یہ کہہ کر کرایا گیا کہ "شاعر بسیار معروف و رومان نویس" ہیں۔

کھانے کے وقت تک اور بہت سے حضرات تشریف لا چکے تھے لیکن میں ہر ایک کا نام نوٹ نہ کر سکا۔

اتحادِ نویسندگان کا دفتر ایک نئی عمارت میں ہے جو ابھی تکمیل کی منزلوں میں تھی۔ یہ عمارت مرزا ترسون زادہ کے نام سے منسوب ہے جو تیس سال اس انجمن کے صدر رہے۔ اِس انجمن کے متعلق آقائے مومنِ قناعت نے مجھے بتایا کہ اس کی بنیاد ۱۹۳۴ میں رکھی گئی تھی۔

شعرا اور ادبا کی زبانی معلوم ہوا کہ تاجیک ادب کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اسی کم مدت میں اس نے صدر الدین عینی اور ابوالقاسم لاہوتی ایسے شاعر پیدا کیے ہیں۔

مرزا ترسون زادہ ایفرو ایشین سوسائٹی کے صدر رہے۔ ان کے ساتھ دہلی میں غالباً بنّے بھائی یا سردار جعفری نے مجھے ملوایا تھا لیکن یہ وہ دور تھا جب اپنی سرکاری ملازمت کی مجبوریوں کی بنا پر مجھے ترقی پسند مصنفین سے دور رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے مرزا ترسون زادہ سے میرا ربط ضبط نہ بڑھ سکا۔ ہندستان اور اہلِ ہند کے ساتھ ان کے بڑے دوستانہ مراسم تھے۔ اُن کی آخری نظم کا عنوان ہے "گنگا سے کریملن تک" اور اس میں ہندستان کا بھرپور ذکر ہے۔

اسی محفل میں مجھے یہ بتایا گیا کہ تاجکستان رائٹرز یونین کے ایک سو نیندہ اراکین ہیں اور اتنے ہی اور بننے والے ہیں۔ تاجکستان کے نوے فی صد ادیب تاجیک میں لکھتے ہیں باقی دس فی صد ازبیک اور روسی میں۔

تاجک رائٹرز یونین ایک میگزین روسی میں شائع کرتی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تاجکستانی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے روسی زبان میں ترجمے کے ذریعے سے سارے یو ایس ایس آر کو آشنا کیا جائے۔ اِس کے زیرِ اہتمام نشر و اشاعت کے دو ادارے چل رہے ہیں جن کے نام ہیں "عرفان" اور "معارف"۔

تاجیک ادیب اب محسوس کر رہے ہیں کہ انھیں فارسی رسم الخط کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہیے اور کسی حد تک اس کی کوششیں شروع ہو چکی ہیں۔ وہ لوگ اسے عربی رسم الخط کہتے ہیں شاید اس لیے کہ ٹائپ میں یہ نسخ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

کھانا بہت لذیذ تھا لیکن میں نے چوں کہ ناشتہ بہت دیر میں کیا تھا اور دوراتوں کا جاگا ہوا تھا اس لیے بھوک نہ تھی۔ قیمے بھرے سنبوسے خاص طور سے بہت عمدہ تھے۔ سب لوگ سنبوسے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ میں نے "سنبوسہ بیسن" والا لطیفہ سنایا۔ ساری محفل قہقہہ زار بن گئی۔ غالباً یہ کلاسیکی لطیفہ ابھی تک تاجکستان میں نہیں پہنچا تھا۔

محفل پہلے ہی لاجواب تھی۔ اِس لطیفے پر ایک بزمِ بے تکلف میں تبدیل ہو گئی۔ شراب کا دور تو چل رہا تھا۔ سامنے طرح طرح کے پھل رکھے تھے۔ جن میں صرف انگور تین قسم کے تھے۔ آقائے امین جان شکوہی نے یہ شعر پڑھا۔

دخترِ رز بہ مسیحا بہ شباہت دارد
بہ رواں بخشی و در دشمن دلی و بے پدری

اس پر مختلف حضرات نے شراب پر اپنے اپنے پسندیدہ اشعار سنائے میں نے سعدیؔ کا یہ شعر پڑھا۔

من آں نیم کہ حلال از حرام نشناسم
شراب با تو حلال است و آب بے تو حرام

اِس کے بعد آقائے امین جان شکوہی نے کہ اس محفل میں معمّر ترین شاعر تھے مجھ سے فارسی کلام سنانے کی فرمایش کی۔ میرے پاس بیاض تو تھی نہیں۔ تعمیلِ ارشاد میں میں نے اپنا کلام زبانی سنایا۔ پہلے یہ رباعی پڑھی۔

گیرم کہ وجودِ من سراپا خاک است　　چیزے است دراں کہ غیرتِ افلاک است
مانندِ سرورے کہ نہاں شد بہ شراب　　ہمرنگ شرابے کہ نہاں در تاک است

محفل میں ہر شاعر اور ادیب نے داد دی۔ ان کا داد دینے کا طریقہ بالکل ہم ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کا سا ہے۔ اس رباعی کی داد بہ بہ٬ واہ وا٬ خیلے بلند٬ اور خیلے نازک ایسے الفاظ کہہ کے دی گئی۔ آقائے شکوہی نے رباعی کا ہر مصرع دہرا کے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد میں نے فرمایش پر مندرجۂ ذیل اشعار پڑھے۔

(۱)

براحوالِ جہاں من صورتِ آئینہ حیرانم
بہ رنگِ غنچہ خاموشم مثالِ بو پریشانم

مرا بنگر٬ نیارم من بہ خاطر کج کلاہاں را
فقیرِ بے نیازِ ہر دو عالم را فشا خوانم

دراں محفل کہ یاراں تلخیِ گفتار می بارند
خورم خونِ دلِ خویش و بہ نغمہ شکر افشانم

بہ ہمراہِ جنوں ضبطِ جنوں در سینہ پروردم
بہار آمد دلم صد چاک شد ثابت گریبانم

رہِ دل منزلِ اوّل٬ غمِ دل منزلِ آخر
جز ایں درسے نمی گیرم جز ایں حرفے نمی خوانم

بہاراں با ہزاراں جلوۂ رنگین و من تنہا
صدائے می زنم ہر سو رفیقانم ارفیقانم

(۲)

ایں کیفِ ما تمام ز خمخانۂ دل است　　عالم اسیرِ گردشِ پیمانۂ دل است
دانی کہ داستانِ طویلِ زمانہ چیست　　یک پارۂ قلیل ز افسانۂ دل است

(۳)

نہ حرفِ لطف نہ بزمِ شبانہ می خواہم　　ز تو فقط نگہ محرمانہ می خواہم
ازاں سبب دلِ صیّاد برہم است ازمن　　کہ در فضائے چمن آشیانہ می خواہم

(۴)

درد و غم نالہ پیہم دے در محفلِ جاناں
سرودم در نوائے شوقِ جاں افسانۂ خود را

بہ افسونم کہ دستِ وقت زہرے ریخت در جامم
جدا لیکن نہ کردم از لبم پیمانۂ خود را

دلِ دیوانہ ام از عقل زاں بیگانہ تر ماند
کہ بے باشد پذیرائی کُنی دیوانۂ خود را

بہل عقل و خرد وز عشق سر تابی مکن ناداں
شبِ تیرہ مگرداں ایں تجلی خانۂ خود را

(۵)

ایں عجب قافلۂ گل بہ چمن می آید　　کہ ز دامانِ صبا بوئے کفن می آید

(۶)

اے فصلِ بہاراں بنگر ایں ضبطِ جنوں را　　شد قلب و جگر چاک و گریباں نہ دریدیم
ما اہلِ ہوا در طلبِ منزلِ مقصود　　چوں باد دویدیم و بہ جائے نہ رسیدیم
عقل و خردِ ما بہ تماشا گہِ عالم　　صد پردہ کشود است و لے ہیچ ندیدیم

(۷)

پیشِ اہلِ نظراں کون و مکاں چیزے نیست
آنچہ پنہاں ہمہ چیز است٬ عیاں چیزے نیست

اے کہ در عشق مرادے ز فغاں می طلبی
ضبط چیزے است و لے آہ و فغاں چیزے نیست

درد با حسنِ بیاں معجزۂ نظم و غزل
در سخن ور نہ فقط حسنِ بیاں چیزے نیست

پختہ ترگیر یقیں را گزر از وہم و گماں
کہ یقیں ہست و لے وہم و گماں چیزے نیست

عشق فرماں دہد از جانِ عزیزم گزرم
عشق مقصود و مرادِ من و جاں چیزے نیست

اے فدا یانِ چمن روحِ چمن چیزے ہست
ایں تماشائے بہاراں وخزاں چیزے نیست

گزر از رطلِ گراں بادہ زساقی بہ طلب
بادہ چیزے است ولے رطلِ گراں چیزے نیست

تو انی نمِ اشکِ سحر از بادگیر
ورنہ آزاد فقط بادِ وزاں چیزے نیست

ان اشعار کی بھی توقع سے زیادہ پذیرائی ہوئی۔

اس کے بعد ہندستان کے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر چھڑا۔ غالباً آقائے فتح نیازی نے سجاد ظہیر کے متعلق ان الفاظ میں پوچھا "شما سجاد ظہیر را بدانید؟ شاعرِ معروف ہندستان بود۔" میں نے اپنے اور ان کے قریبی مراسم کا ذکر کیا۔ پھر گوربخش سنگھ، تو تیج، امرتا پریتم اور ریہ جوت کور کا ذکر آیا اور ان لوگوں نے کہا کہ ہندستان جاکے ہمارا سلام ان سب تک پہنچا دیجیے گا۔

ہندستانی ادیبوں سے بات چیت کا رخ پھر بیدل کی شاعری کی طرف ہو گیا اور آقائے امین جان شکوہی نے جنھیں بیدل کے بہت سے اشعار یاد تھے بیدل کا یہ شعر پڑھا

زندگانی در جگر خار است و دریا سوزن است
تانفس باقی است در پیراہنِ ما سوزن است

میں نے بیدل کا قریب قریب اسی موضوع کا یہ شعر پڑھا۔

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

ابھی میں نے پہلا مصرع ہی پڑھا تھا کہ تمام حاضرینِ مجلس نے دوسرا مصرع پڑھ دیا۔ اس پر "اتحادِ نویسندگان" کے صدر آقائے مومن قناعت نے بتایا کہ تاجکستان میں مکتبۂ بیدل بہت مقبول ہے۔ یہاں بیدل شناسوں کی ایک خاصی بڑی جماعت موجود ہے۔ اس جماعت کے باقاعدہ اجلاس ہوتے ہیں۔ بیدل کا کلام پڑھا جاتا ہے اور اس پر تقریریں ہوتی ہیں۔ سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے کہا کہ بیدل کے الفاظ آسان ہیں لیکن بعض جگہوں پر مفہوم بہت مشکل ہے۔ کلامِ بیدل میں ہندی اصطلاحات بھی ہیں جو ہم لوگوں کے لیے مشکل پیدا کرتی ہیں۔ اس پر آقائے شکوہی نے بیدل کا ایک مصرع پڑھا

صورتِ خمیازہ دارد چینِ دامانِ سحر

لیکن چوں کہ دوسرا مصرع سامنے نہیں تھا اس لیے اس شعر پر بحث نہ ہو سکی۔ آقائے شکوہی نے ایک اور شعر پڑھا

خاک شد فطرت بہ پستی لیک مژگاں برنخاست   ورنہ از ما تا بہ بامِ آسماں یک زینہ بود

اور کہا کہ اس شعر کا مفہوم سمجھنے میں دشواری آ رہی ہے۔ میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں اس شعر کی تشریح کی۔ اس تشریح پر آقائے شکوہی نے کہا "خوش گفتی" اور ساتھ ہی بعض اور حضرات نے "شاباش" اور "خیلے خوب" کہہ کے میری تشریح کی تائید کی۔

اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی اور رات کا کھانا بھی "اتحادِ نویسندگان" کی طرف سے تھا۔ درمیان میں مجھے ڈاکٹر کے پاس بھی جانا تھا کیوں کہ مسلسل دو راتیں جاگتے رہنے کے بعد اندیشہ تھا کہ کہیں تیسری رات بھی ایسی ہی نہ گزرے۔ زرافگم اسٹور تک بھی جانا تھا چنانچہ میں نے اجازت طلب کی۔ اس پر آغائے باقی رحیم زادہ نے یہ شعر پڑھا

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

آقائے شکوہی تو شعر کا خزانہ ہیں۔ انھوں نے فوراً ہی کہا

ز انتظار برہست طاقتِ نظارہ نماند
بیا کہ چشمِ مرا کاسۂ گدا کردی

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس محبت بھرے سلوک سے میں کس قدر متاثر ہوا۔

میری روانگی سے قبل آقائے مومن قناعت نے ایک الوداعی تقریر کی جس میں انھوں نے زبان کی بنا پر ہندستان، پاکستان اور تاجکستان کی دوستی کو بہت اہم قرار دیا اور کہا کہ ہندستان اور تاجکستان کی تہذیب بڑی حد تک مشترک ہے۔ ہم دونوں کو آپس میں سنسکرت، رگ وید اور اوستا ایک ہی رشتے میں پرو رہے ہیں۔ بارھویں صدی سے ہندستان میں جو تخمِ سخن بارآوری کرتا چلا آ رہا ہے وہ ہندستان اور سارے جہان کے لیے باعثِ فخر ہے۔ بیدل، خسرو ہوں یا اقبال یہ سب دنیا بھر کے لیے سامانِ فخر و مباہات ہیں۔ ان شاعروں نے اپنی شاعری سے فلسفے کو رنگین تر بنا دیا ہے۔ زمانۂ قدیم کی یہ وابستگی، تمدنی تعلق اور دوستی کے رشتے آج دونوں ملکوں کے لیے وقت کی بڑی ضرورت ہیں۔ ہماری دلی مراد بھی ہے کہ یہ رشتے اور زیادہ محکم ہوں۔ تقدیرِ تمدن اور تقدیرِ جہاں بڑی حد تک اسی دوستی سے وابستہ ہے۔ آپ کی سرزمین ہندستان نعمت ہائے معنوی سے بھرپور ہے اور تاجکستان کے شعرا نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔"

آقائے مومن قناعت کی اس تقریر کے بعد میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں تقریر کی جس کے ساتھ ہی یہ پُرلطف صحبت ختم ہوئی۔

نیچے آئے تو آقائے مومن قناعت، آقائے فاتح نیازی اور آقائے رحیم زادہ نے مجھے "اتحادِ نویسندگان" کی مطبوعات عنایت کیں اور میں ان حضرات کا شکریہ ادا کر کے اجازت طلب ہوا۔

"اتحادِ نویسندگان" نے رات کے کھانے کی دعوت اپنی جس عمارت میں دی وہ شہر سے بیس پچیس میل دور تھی۔ ایسے مکانوں کو انگریزی میں

Country house

کہتے ہیں روسی میں ڈاچا کہتے ہیں۔ آقائے عبدالستار ترسون زادہ مجھے اور الیگزینڈر کو چار پانچ بجے ہی لے کے ڈاچا کی طرف چلے۔ یہ ڈاچا بہت ہی پر فضا مقام پر پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ ہم سیر کے خیال سے دس پندرہ میل اور آگے نکل گئے۔ کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں رستے میں آئے۔ تمام عورتوں کو قمیص شلوار میں ملبوس دیکھا۔ بعض نے سروں پر دوپٹے بھی اوڑھ رکھے تھے۔ قمیص اور شلوار میں ملبوس عورتیں مجھے اکا دکا دوشنبہ میں بھی نظر آئی تھیں اور پتا یہ چلا تھا کہ قمیص شلوار اور دوپٹہ ہی تاجکستان کی عورتوں کا قومی لباس ہے۔ اسکرٹ صرف شہروں تک محدود ہے۔ دیہات میں عورتیں قمیص شلوار ہی پہنتی ہیں دوپٹے کا رواج بھی عام ہے اور اس اعتبار سے یہاں کی عورتیں پنجاب اور کشمیر کی عورتوں کی طرح نظر آتی ہیں۔

شہر سے نکل کے ہماری گاڑی نے دریائے ورزوب کا رخ کیا اور بہت دیر تک دریا کے کنارے کنارے چلتی رہی۔ ہمارے ایک طرف پہاڑ تھا۔ ایک طرف دریا اور دریا کے اس کنارے بھی پہاڑ۔ گویا ایک طرح سے لِدر کا سا منظر تھا۔ یہ میں صرف دریا کا حدودِ اربعہ بیان کر رہا ہوں ورنہ یہ پہاڑ خشک تھا۔ دریا کے نام کی طرح پہاڑ کا نام بھی ورزوب ہے۔

ایک جگہ پہاڑی چشمہ بہہ رہا تھا۔ اس پر ایک پائپ سا لگا ہوا تھا۔ یہ پانی بہت شیریں اور مصفا تھا۔ ہم نے پیا۔ طبیعت تر و تازہ ہو گئی۔ وہاں سے ہم ڈاچا میں پہنچے۔ شعرا اور ادبا ایک ایک کر کے آ رہے تھے۔ ملتے وقت سب السلام علیکم کہتے ہیں جسے سن کے جی خوش ہو جاتا ہے۔

کھانے میں بہت چیزیں تھیں۔ پلاؤ ایسا لذیذ تھا کہ اس کی لذت لفظوں میں بیان نہ ہو سکے۔ زندگی میں ایسا پلاؤ نہ کبھی دیکھا نہ کھایا نہ سنا۔ تاجکستان کی روٹی بھی دیکھی بہت بڑی، بہت لذیذ اور بہت زود ہضم۔ کھانے کے دوران میں شراب پانی کی طرح چلتی رہی۔ دن میں جن شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی تھی وہ قریب قریب سب موجود تھے۔ ان کے علاوہ "اتحادِ نویسندگان" کے اور ارکین بھی تھے۔ اس ڈنر میں شرکت کے لیے ہفتہ وار "کراکوڈائیل" (ماسکو) کے اڈیٹر مسٹر آندرے کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ وہ بہ طورِ خاص ماسکو سے آئے تھے۔

اس کھانے میں بھی دن کی طرح شاعری اور لطیفوں کا دور جاری رہا۔ آندرے اور الیگزینڈر کے لیے میزبان حضرات بات چیت کبھی روسی میں شروع کر دیتے تھے ورنہ تاجیکی ہی میں محفل گرم رہی۔

ڈنر کے خاتمے پر آقائے بعیروف مدیرِ "خارپشت" نے ایک تقریر کی جس میں انھوں نے آندرے کی اور میری موجودگی پر اظہارِ مسرت کیا اور جذبات سے لبریز ہو کے کہا کہ ہم شہر دوشنبہ کی کنجیاں آقائے آندرے مدیر "کراکوڈائیل" اور آقائے جگن ناتھ آزاد پروفیسر جموں یونی ورسٹی کی نذر کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی اپنے دل کی کنجیاں بھی انھیں پیش

کرتے ہیں۔ ان کے اس جملے نے مجھے آب دیدہ کر دیا۔

اس کے بعد مجھ سے تقریر کے لیے کہا گیا۔ میں نے پھر فارسی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ میں بہت اٹک اٹک کے بول رہا تھا لیکن اس کے باوجود میز کے ہر گوشے سے مرحبا، شاباش اور آمین کی صدائیں آ رہی تھیں۔

ایک ادیب اس محفل کے ختم ہونے کے بعد بھی میز پر رکھے ہوئے گلاسوں کو شراب سے بھر رہے تھے اور تمام شرکائے مجلس کو پینے پر مجبور کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اس وقت پیٹ میں سوائے سگرٹ کے دھوئیں کے اور کسی چیز کی جگہ نہیں۔ اس پر انھوں نے یہ شعر پڑھا

شراب لطفِ خداوند را گرانی نیست
اگر گراں بشود از قصورِ جام بود

ایک اور صاحب نے اٹھتے ہوئے میزبانوں اور مہمانوں کو پھر روک لیا اور مختلف کھانوں سے بھری ہوئی پلیٹیں پھر ان کے سامنے کر دیں اور مجھ سے اور آندرے سے مخاطب ہو کے کہا کہ تم دوشنبہ کو اپنا گھر سمجھو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو ہمارے دوست ہو اور پھر رودکی کا یہ شعر پڑھا۔

ہیچ شادی نیست اندر ایں جہاں
برتر از دیدارِ روئے دوستاں

اٹھتے اٹھتے مومن قناعت نے طوس کے زلزلے کی خبر سنائی اور کہا کہ طوس ختم ہو گیا ہے اور طوس کا دربار زمین کے نیچے چلا گیا ہے۔ اس خبر سے دل اداس ہو گیا۔

طوس کا ذکر کرتے ہی انھوں نے فردوسی کے اشعار پڑھے۔ ان اشعار سے بات چیت کا رخ فردوسی کی شاعری کی طرف مڑ گیا۔ میں نے شاہ نامے کے تعلق سے محمود غزنوی کی ہجو کا ذکر کیا اور کہا کہ بقولِ محمود شیرانی یہ اشعار الحاقی ہیں۔ آقائے مومن قناعت کو انھیں الحاقی تسلیم کرنے میں تامل تھا۔

آخر میں رخصت ہوتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ حضرات نے اتنا کھلا دیا ہے کہ ایک قدم چلنا بھی دشوار ہو رہا ہے۔ اس پر آقائے فضل دینِ محمدی نے جواب دیا کہ مسلمان وہ ہے جو اپنے آپ کو ختم کر دیتا ہے اپنا گھر جلا دیتا ہے لیکن مہمان کی عزت کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ شعر پڑھا

صد کعبۂ آب و گل بہ یک دل نہ رسد
در کعبہ چہ می روی دلے را دریاب

ہوٹل واپس پہنچے تو بارہ بج چکے تھے۔ میں نے اس ڈر سے کہ شاید آج تیسری رات پھر بے خوابی کی نذر ہو جائے ڈاکٹر کی دی ہوئی دوا کھائی اور گہری نیند سو گیا۔

۲۰

تاجکستان یونی ورسٹی، دوشنبہ

پھر ذکرِ اقبال

اگلی صبح تیار ہو کے ناشتے پر جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اندر ہی سے کہا "مرحمت"، ایک صاحب تشریف لائے اور اپنا تعارف کرایا۔ ان کے ساتھ "اتحاد نویسندگان" کی محفلوں میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ غالباً فیروز وف ان کا نام تھا۔ فارسی کے متعدد کلاسیکی شعرا کے اشعار انھیں یاد تھے۔ کوئی آدھ گھنٹہ باتیں کرتے رہے۔ میں بھی اپنی فارسی دانی کی مشق کرتا رہا جب چلنے لگے تو ہدیتاً یہ دو اشعار میرے حوالے کیے۔

در شہرِ ما کہ حضرتِ آزاد آمدہ — دلشاد می روند کہ دلشاد آمدہ
بال اے ریاضِ ارضِ دوشنبہ کہ بہرِ تو — از باغِ ہند صورتِ شمشاد آمدہ

اتنی محبت اور اتنی مہمان نوازی کو دیکھ کے مجھے لاہور یاد آگیا اور نہ جانے میں کتنی دیر تک اپنے تصور میں انار کلی میں اور مال روڈ پر گھومتا رہا۔ جو محبت لاہور میں ملتی تھی قریب قریب اسی طرح کی محبت دوشنبہ میں مل رہی تھی۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا۔

ناشتے کے بعد آقائے ستار ترسون مجھے نیو ایک کا بجلی گھر (ہائیڈرو الیکٹرک پاور اسٹیشن) دکھانے لے گئے جس سے ستائیس لاکھ کلو واٹ بجلی پیدا کرنے کے منصوبے پر عمل ہو رہا تھا اس پاور اسٹیشن کو تکمیل کے بعد کل نو مشینوں پر مشتمل ہونا تھا چھ مشینیں کام کر رہی تھیں اور ساتویں کا آج افتتاح ہونا تھا۔ گویا اس اعتبار سے پاور ہاؤس کے لیے یہ ایک تاریخی دن تھا۔

پاور ہاؤس کے دفتر میں پہنچے تو سیکریٹری ٹاؤن پارٹی کمیٹی نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ انھیں دیکھ کے مجھے اپنے دوست بخشی غلام علی ڈائرکٹر انفارمیشن حکومتِ جموں و کشمیر یاد آگئے

ان کے چہرے مہرے پر بخشی غلام علی ہی کا گمان ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنا نام یاروف مراد یار اوچ بتایا۔

اس ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ کے بارے میں یاروف مراد نے مجھے اتنی اطلاعات بہم پہنچائیں کہ انھیں اگر جمع کیا جائے تو ایک کتاب بن سکتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ دنیا کا سب سے اونچا پاور اسٹیشن ہے۔ میں نے کہا کشمیر میں سندھ ہائیڈرو الیکٹرک پاور اسٹیشن غالباً دنیا کا سب سے اونچا پاور اسٹیشن ہے لیکن مجھے چوں کہ سندھ ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشن کی اونچائی یاد نہیں تھی۔ اس لیے اس باب میں قطعیت کے ساتھ میں بات نہ کر سکا۔ اپنے مذکورہ پاور اسٹیشن کی اونچائی انھوں نے تین سو میٹر بتائی۔

جب وہ سب کچھ زبانی بتا چکے تو ایک اور انجینئر صاحب ہم کو گاڑی میں بٹھا کے پاور اسٹیشن دکھانے لے چلے۔ موٹر چکر کاٹتی ہوئی پہاڑ کے اوپر جا پہنچی۔ وہاں ایک خوبصورت مصنوعی جھیل بنی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کے مجھے بھاکڑہ ننگل یاد آگیا۔ منظر ویسا ہی خوبصورت تھا۔ انجینیر نے بتایا کہ یہاں نو ہزار ورکر کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ کام کرتے ہوئے نظر نہیں آ رہے تھے۔ پتا چلا کہ تقریباً سب کے سب زیرِ زمین کام کر رہے ہیں۔ اس پراجیکٹ کے ایک حصے میں ایک جگہ فولاد کی بنی ہوئی ایک دو منزلہ عمارت نظر آئی۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ یہ عمارت چلنے لگی۔ پتا چلا کہ یہ کرین ہے اور تین سو ساٹھ ٹن وزن اٹھا سکتی ہے۔ اس کے قریب ہی اسی طرح کی ایک اور کرین بھی موجود تھی۔

اس پراجیکٹ پر سارے یو۔ ایس۔ ایس۔ آر میں اڑتالیس قومیتوں کے لوگ کام کر رہے ہیں۔ بلگیرین، جرمن، پولش، روسی وغیرہ۔

یہ خوب صورت منظر دیکھ کر ہم کوئی دو بجے واپس لوٹے۔ تین بجے یونی ورسٹی میں مجھے مقالہ پڑھنا تھا

Iqbal's Philosophy of Life

مقالے سے پہلے تمہیدی تقریر تو میں نے فارسی میں کی لیکن اندیشہ تھا کہ شاید انگریزی کا مقالہ سامنے رکھ کے اس کا فی البدیہہ ترجمہ فارسی میں نہ کر سکوں۔ اس لیے مقالہ میں نے انگریزی ہی میں پڑھا جس کا روسی ترجمہ الیگزینڈر ساتھ ساتھ کرتے چلے گئے لیکن جہاں کہیں مجھے گمان ہوتا تھا کہ الیگزینڈر نے بہت اختصار سے کام لیا ہے وہاں میں خود فارسی میں ترجمہ پیش کر دیتا تھا۔ طلبہ بہت توجہ سے مقالہ سنتے رہے۔ جب مقالہ ختم ہوا اور اس پر سوالات شروع ہوئے تو مجھے یقین ہو گیا کہ الیگزینڈر کے روسی ترجمے کے ساتھ میرا فارسی ترجمہ اکارت نہیں گیا۔ سوالات چوں کہ فارسی میں تھے۔ میں نے جوابات بھی فارسی ہی میں دیے — ایک سوال بہت ہی عمدہ تھا اور وہ یہ کہ اقبال کا نظریۂ ملت کیا ہے؟ میرا جواب طلبہ نے پوری دل چسپی اور توجہ سے سنا۔ میں جب اپنا جواب ختم کر چکا تو میں نے طلبہ سے پوچھا آپ حضرات مسلمان ہیں یا کمیونسٹ۔ اس پر اسی طالب علم نے جس نے سوال کیا تھا ہنستے ہوئے کہا ہم تاجیکی ہیں۔

اس دل چسپ جواب کے بعد صدر محفل پروفیسر فرہاد و دیہاتی رئیس شعبۂ عربی نے تقریر کی۔ فارسی میں۔ انھوں نے میرے مقالے پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ آخر میں میں نے شکریہ ادا کیا۔ اکثر طلبہ نے آٹوگراف لیے اور باہر مجھے گاڑی تک پہنچانے آگئے۔

رات سے دانت میں درد تھا۔ اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن میں نے سوچا کہ کسی ڈاکٹر کو دکھا لیا جائے۔ ستار ترسون بڑے ہسپتال میں لے گئے جہاں ایک دن قبل وہ مجھے خواب آور دوا دلوانے لے گئے تھے۔ اب کے وہ مجھے چیف میڈیکل آفیسر کے پاس لے گئے وہ بڑی محبت سے پیش آئے اور نہایت اخلاق سے ملے۔ اپنا نام انھوں نے ظفر ظہور بتایا۔ جب میں ڈائری میں لکھنے لگا تو بولے کہ ظہوروف لکھیے اور پھر ہنستے ہوئے کہا ہم لوگ یہاں ظہوروف بن جاتے ہیں۔ انھوں نے ڈینٹل سرجن کو اپنے کمرے میں زحمت دی۔ میرا بہت اچھے لفظوں میں تعارف کرایا۔ ڈینٹل سرجن مجھے اپنے ساتھ اپنے کمرۂ علاج میں لے گئے۔ وہاں وہ کوئی آدھ گھنٹہ تک دانت کا علاج کرتے رہے۔ بولے یہ علاج دو تین دن تک چلنا چاہیے لیکن آپ کل صبح ماسکو جا رہے ہیں اور پرسوں ہندستان تو ہمارا علاج نامکمل رہ جائے گا۔ میں نے اتنا کر دیا ہے کہ چار پانچ روز تک آپ کے دانت میں درد نہیں ہوگا لیکن جیوں ہی پہنچ کے آپ کسی ڈینٹل سرجن سے مشورہ کرلیں۔ وہ پہلے ایکس رے کرے گا اس کے بعد آپ دو تین روز کے علاج سے بالکل اچھے ہو جائیں گے۔ درد کے بارے میں ان کی بات صحیح نکلی۔ رات تک درد بالکل رفع ہو چکا تھا اور اس کے بعد کئی روز تک مکمل آرام رہا۔

▲

(۲۱)

ماسکو میں تیسری بار

۱۲ ستمبر کی صبح کو میں دوشنبہ سے واپس ماسکو روانہ ہوا۔ ستار ترسون ایرپورٹ تک پہنچانے آگئے۔ وہیں ایرپورٹ ہی پر عبداللہ جان غفاراف سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ملاقات دہلی اور لاہور میں ہو چکی تھی۔ دونوں جگہوں پر اقبال صدی تقاریب کے سلسلے میں مل کے بہت خوش ہوئے۔ ان کے ساتھ اردو ہی میں بات ہوئی۔ غفاراف صاحب اردو بہت اچھی جانتے ہیں۔ بولے آپ کی ایک کتاب میرے پاس ہے۔ دہلی میں مجھے ملی تھی۔ میں نے سوچا "مرقع اقبال" کی بات کر رہے ہیں جو اقبال صدی تقاریب کمیٹی کی طرف سے ہر مندوب کو ملی تھی چنانچہ میں نے کہا مجھے معلوم ہے "مرقع اقبال" ہے۔ بولے "مرقع اقبال" "نہیں میکراں"۔ اتنے میں جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا اور میں نے ستار ترسون اور غفاراف صاحب سے اجازت لے کر طیارے کا رخ کیا۔

غفاراف صاحب نے یہ بھی بتایا کہ پروفیسر ایسی موو بھی دوشنبہ میں ہیں۔ مجھے ان سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہوا۔ میں اس خیال میں رہا کہ تاشقند میں ہیں۔ ایسی موو سے بھی دہلی اور لاہور دونوں جگہ پر ملاقات ہو چکی تھی۔ میں اس کوتاہی پر آج تک افسوس کر رہا ہوں ؎ "بازمی خواہم کہ پیمایم رہ پیمودہ را"

آٹھ بجے صبح دوشنبہ سے چل کے ہم لوگ بارہ بجے ماسکو پہنچ گئے۔ لیکن ماسکو میں ابھی نو ہی بجے تھے اس لیے گھڑی کو تین گھنٹے پیچھے کر دیا۔

اب کے میرا قیام ایک اور ہوٹل میں تھا۔ اس کا نام تھا یوکرین ہوٹل۔ یہ شہر کی ان سات بلند عمارتوں میں سے ایک میں ہے جو اسٹالن نے جنگ عالم گیر کے فوراً بعد ماسکو میں بنوائی تھیں۔ باہر سے یہ عمارت قلعہ نظر آتی ہے اور اندر سے محل۔

ہوٹل میں پہنچتے ہی ڈاکٹر گاندھی کو ٹیلی فون کیا۔ انھوں نے یہ مژدہ سنایا کہ میرے سفر ایران کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں چنانچہ میں پاسپورٹ، ویزا اور ایر انڈیا کا دہلی کا ٹکٹ لے کے سفارت خانے میں پہنچا۔ وہاں جب سب کام مکمل ہو چکا تو پتا چلا کہ

ایرو فلوٹ میں سیٹ ۲۵ر ستمبر سے قبل نہیں ملے گی۔ اب ماسکو میں تین دن بغیر کسی پروگرام کے قیام کرنا مناسب نظر نہ آیا اس لیے ہندستان روانہ ہونے کے پروگرام پر جو پہلے سے طے ہو چکا تھا عمل کرنا زیادہ انسب سمجھا۔

یہاں میں نے اس خط کے بارے میں دریافت کیا جو ناروے سے آیا تھا اور جو غالباً رام لعل یا ہرچرن چاولہ نے لکھا ہو گا۔ یہ خط نہ ملا۔ معلوم ہوا کہ کھو گیا ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔

اس روز دن کو جب میں بفے میں کھانا کھا رہا تھا تو ساری میں ملبوس ایک خاتون بفے میں داخل ہوئیں۔ وہ چائے پینے آئی تھیں۔ ساری سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ ہندستانی خاتون ہیں۔ اس وقت تو ان سے بات نہ ہوئی کیوں کہ وہ کسی اور کے ساتھ محوِ گفتگو تھیں لیکن لفٹ کے سامنے ان سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے پوچھا آپ ہندستان سے آئی ہیں۔ انھوں نے کہا "جی ہاں" میں نے اپنا تعارف کرایا۔ بولیں میں نے آپ کے بارے میں بہت سنا ہے ابھی میں کشمیر گئی تھی تو آپ کا ذکر کئی جگہوں پر آیا۔ جب انھوں نے اپنا نام بتایا — انیس جنگ — تو میں بہ یک وقت مسرت اور ندامت کے عالم میں غرق ہو گیا۔ میں نے کہا معذرت چاہتا ہوں کہ ہندستان میں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ ویسے کون ہے جو "یو تھ ٹائمز" کے ذریعے سے آپ کو نہیں جانتا۔ سری نگر میں ایک بار میرے بیٹے اور ش کمار نے آپ سے ٹیلی وژن پر انٹرویو لیا تھا۔ انھیں وہ انٹرویو یاد تھا کہنے لگیں وہ بہت لائق لڑکا ہے اور اس نے بہت عمدہ انٹرویو لیا تھا۔ میں نے انھیں بتایا کہ وہ آج کل لکھنؤ ٹیلی وژن سینٹر میں پروڈیوسر ہے۔

▲

(۲۲)

زشیشہ تا بہ قدح ریختیم

اگلا دن میری اس سیاحتِ روس کا آخری دن تھا۔ ۲۲ر ستمبر۔ دراصل ہندستان کو میری روانگی کی تاریخ ۲۳ر ستمبر تھی لیکن رات کے بارہ بج کے پانچ منٹ پر (انگریزی میں 12.05 A.M. پر) اور مجھے چوں کہ ہوٹل سے رات کو دس بجے ایرپورٹ روانہ ہو جانا چاہیے تھا اس لیے میرے نزدیک ۲۳ر ستمبر کے معنی ۲۲ر ستمبر ہی تھے۔

شاید میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اورینٹیل فیکلٹی اکیڈمی آف سائنسیز میں جب میں پروفیسر چیلی شیو سے ملنے گیا تھا تو ماسکو نیوز کے نمایندے مسٹر ڈلنین سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے "انڈو سوویٹ دوستی" پر اپنے ہفتہ وار کے لیے ایک مقالہ لکھنے کی فرمایش کی تھی۔ یہ مقالہ میں نے ریگا روانہ ہونے سے قبل ہی لکھ لیا تھا لیکن انھیں دے نہ سکا تھا۔ ریگا اور لنن گراڈ کے سفر سے جب میں واپس آیا تو ہفتہ اور اتوار ہونے کے باعث اُن سے ملاقات نہ ہو سکی اور میں تاجکستان چلا گیا۔ اب جب ماسکو واپس آیا اور اُن سے ٹیلی فون پہ بات ہوئی تو انھوں نے اپنی فرمایش دُہرائی۔ میں نے بتایا کہ وہ مقالہ بہت دن سے تیار ہے۔ بولے میں کل صبح خود آؤں گا اور آ کے لے جاؤں گا۔ چنانچہ ۲۲ر کی صبح کو وہ ساڑھے آٹھ بجے آگئے۔ بڑے تپاک اور بڑی محبت سے ملے۔ اہلِ روس اس معاملے میں بالکل ہم ہندستانیوں کی طرح ہیں۔ بولے میں بہت جلدی میں ہوں۔ صرف مقالہ لینے آیا ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں صحافی ہر وقت جلدی میں ہوتا ہے اور آج جمعہ ہے اور چوں کہ جمعہ کے روز ہمارا اخبار پریس میں جاتا ہے اس لیے میں رُک نہ سکوں گا۔ یہ کہہ کے انھوں نے بڑے تپاک سے معانقہ کیا اور رُخصت ہوئے۔

میرا خیال تھا انھیں ناشتے کے لیے روکوں گا لیکن وہ چوں کہ جلدی میں تھے اس لیے میں ناشتے پر تنہا نیچے پہنچا۔ وہاں ایک میز پر دو اشخاص بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ چہرے مہرے سے ہندستانی نظر آئے۔ میں نے ان کے پاس جا کے ان سے پوچھ ہی لیا۔ دونوں ہندستانی تھے۔ مسٹر سیھر امنیم اور مسٹر سری واستو۔ دونوں بھلائی اسٹیل پلانٹ میں انجینئر تھے اور بھلائی اسٹیل پلانٹ ہی کے سلسلے میں ماسکو آئے تھے۔ روس کے ساتھ ہماری دوستی کا یہ ایک اور پہلو ہے جس کا ذکر کرنا میں اپنے مذکورہ مقالے میں بھول گیا تھا۔

ناشتہ کر کے کمرے میں واپس آیا۔ انیس جنگ کو ٹیلی فون کیا۔ کمرے میں موجود تھیں۔ انھوں نے اپنا پروگرام بتایا کہ وہ پہلے سائبیریا اور پھر تاجکستان جا رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ اب آپ سے ملاقات دہلی میں ہوگی۔ انھوں نے اپنا دہلی کا پتا اور ٹیلی فون نمبر دیا اور مجھ سے میرے بیٹے آدرش کا پتا پوچھا۔ میں نے انھیں لکھوا دیا۔ بولیں اسے لکھیے کہ میں عن قریب لکھنؤ آؤں گی اور اس سے ملوں گی۔

سوا گیارہ بجے ہندستانی سفارت خانے گیا۔ گجرال صاحب کے ساتھ وقت طے تھا روس کے مختلف شہروں کے سفر کی داستان انھیں سنائی۔ بہت خوش ہوئے۔ تھوڑی دیر باتیں رہیں۔ ڈاکٹر گاندھی اور سفارت خانے کے دوسرے احباب سے ملاقات کی اور ہوٹل واپس آگیا۔ ڈاکٹر گاندھی کی موجودگی نے اس سفر میں کئی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔

سہ پہر کو ساڑھے تین بجے ریڈیو پر ریکارڈنگ کا پروگرام تھا۔ چنانچہ وقتِ مقررہ پر ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ اسٹیشن سے میں نے شاہدہ کو ٹیلی فون کیا کہ حاضر ہو گیا ہوں۔ وہ خود نیچے آئیں۔ ان کے ساتھ ایک روسی لڑکی تھی اس نے اپنا نام ایرا بتایا۔ مکمل نام ایرینا۔ یہ تین نام ایرینا، نتاشا اور تانیا لڑکیوں کے ایسے نام ہیں جو روس میں ہر گھر میں مل جائیں گے۔ ایرا اردو بہت اچھی بول رہی تھی۔ کہنے لگی کہ آپ سے انٹرویو میں ہی لوں گی اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ میں نے کہا اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ یہ تو میرے لیے بڑی مسرت کا مقام ہے۔ اسی دوران میں شاہدہ نے بتایا کہ میری آپ کے ساتھ ملاقات ہو چکی ہے۔ سری نگر میں، آپ کے دفتر میں۔ مجھے یاد نہ آیا تو انھوں نے اپنا مزید تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں ساجدہ اور زاہدہ کی بہن ہوں۔ اس پر مجھے سری نگر کی ملاقات مفصل طور پر یاد آگئی جب بارش کے باعث ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی اور شاہدہ کو دہلی واپس آنے کے لیے طیارے کا ٹکٹ نہیں مل رہا تھا۔ اُس وقت بارش نے سری نگر میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔

تو شاہدہ اور ایرا کے ساتھ میں اوپر ان کے دفتر میں گیا۔ وہاں تو محفلِ اردو جمی تھی۔ انور مرزا سے ملاقات ہوئی۔ پتا چلا اشفاق مرزا کے چھوٹے بھائی ہیں۔ میں نے کہا۔ بھئی آپ کے متعلق مجھ سے ہندستان میں کسی نے ذکر نہیں کیا ورنہ میں آپ سے ضرور ملتا۔ اشفاق صاحب کا پتا تو سردار جعفری نے دے دیا تھا۔ انھوں نے کہا فیض میرے محترم دوست ہیں

اور مہدی عزیز دوست۔ آپ دہلی واپس جائیں تو ان دونوں سے میرا سلام کہیں۔

ان کے ساتھ ہی ایک اور صاحب شاید ترجمے میں مصروف تھے ان کا نام جسونت سنگھ ہے۔ اس کے بعد شاہدہ نے اپنے شوہر سے ملوایا اور تین اور روسی لڑکیوں سے تعارف کرایا جو اسی شعبۂ اردو میں کام کرتی ہیں۔ ایک ریٹا جو اردو اناؤنسر ہیں۔ دوسری آلا (اعلا؟) یہ سینیئر اردو مترجم ہیں۔ شاہدہ کے شوہر نے کہا کہ یہ آلا یا اعلا نہیں ہیں اللہ ہیں۔ میں نے انھیں سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور اللہ کی شانِ جمالی مجھے ان میں نظر آئی۔ تیسری کا نام ہے رگینیا۔ رگینیا نے اردو میں مجھے بتایا کہ رگینیا کے معنی ہیں مہارانی۔ میں نے کہا کہ اگرچہ ہم لوگ راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور بادشاہوں کے مخالف ہیں لیکن شہزادیوں، رانیوں اور مہارانیوں سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں۔ بلکہ انھیں تو ہم پسند کرتے ہیں۔ یہ بات رگینیا کو اچھی لگی اور بولی میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

میں اس محفلِ اردو میں ابھی اور کچھ دیر رکنا چاہتا تھا لیکن میرے گائڈ کو بہت جلدی تھی۔ چنانچہ بادلِ ناخواستہ اٹھنا پڑا۔ گائڈ نے مجھے ہوٹل میں پہنچایا۔ اس وقت چھے بجے تھے۔ ہوٹل سے میری روانگی کا وقت دس بجے تھا۔ اب چار گھنٹے ہوٹل میں بیکار بیٹھے رہنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

کمرے میں داخل ہوا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ یہ حبیب الرحمٰن کا ٹیلی فون تھا۔ آج ان کی طبیعت کل سے زیادہ خراب تھی۔ اس بات پر انھوں نے بہت اظہارِ افسوس کیا کہ وہ مجھے اپنے یہاں مدعو نہیں کر سکے۔ میں نے کہا یہ خطا تو میری ہے۔ ایک تو میرا پروگرام بھاگم بھاگ کا رہا دوسرے ٹیلی فون کے بارے میں کبھی یہ پتا نہ چل سکا کہ گھنٹی کے بجنے کی آواز مصروف ہونے کی آواز اور خراب ہونے کی آواز میں کیا فرق ہے۔ بہر طور ملاقات تو ان سے تقی حیدر کی دعوت میں ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر باتیں رہیں۔ باتوں کے دوران میں میں نے محسوس کیا کہ ان پر تھکن طاری ہو رہی ہے۔ چنانچہ میں نے انھیں آرام کا مشورہ دیا۔

تقی حیدر کو کئی بار ٹیلی فون کیا۔ وہ نہ ملے۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ آج باہر جائیں گے لیکن ساڑھے بارہ بجے تک واپس آ جائیں گے۔ شام کو جب میں نے ٹیلی فون کیا تو غالباً اس وقت بھی گھر پر نہ تھے۔ ہوچی کا ٹیلی فون آیا۔ بہت دیر باتیں رہیں۔ ان تمام ٹیلی فونوں کے باوجود ابھی تک صرف سات ہی بجے تھے۔ میں نے سوچا ہوٹل کے قریب ہی دو ایک اسٹوروں کی سیر کرنا چاہیے لیکن باہر نکلا تو بارش ہو رہی تھی۔ واپس آگیا۔ ہوٹل کے اندر ہی ایک دکان سے روس کے مناظر کی تصویریں خریدیں۔ کھانا کھایا اور الیگزینڈر کا انتظار کرنے لگا۔

الیگزینڈر حسبِ وعدہ دس بجے پہنچے۔ سامان گاڑی میں رکھا اور گیارہ بجے تک طیارہ گاہ پر پہنچ گئے۔ وہاں سفارت خانے کے فرسٹ سکریٹری ترپاٹھی جی اور ان کی بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ ایک اور ہندستانی ڈپلومیٹ وطن واپس آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ تھوڑی دیر بات چیت رہی۔ اتنے میں طیارہ جس سے مجھے دہلی آنا تھا لندن سے آ پہنچا۔ ہم لوگ ٹرانزٹ لاؤنج میں بیٹھے تھے ایک سردار جی لاؤنج میں داخل ہوئے۔ مسز ترپاٹھی اور ترپاٹھی جی اُن کی پیشوائی کو آگے بڑھے۔ یہ مسز ترپاٹھی کے چچا تھے۔ جب میں اُن کے قریب پہنچا تو انھوں نے بڑی مسرت آمیز

حیرت کے ساتھ کہا "جگن ناتھ، یہ ملک کے مشہور اہلِ قلم ڈاکٹر گوپال سنگھ تھے جو نیو یارک اور لندن سے لیکچر ٹور کے بعد واپس آ رہے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے اور بہت دیر تک میرے والد محترم مرحوم صاحب کا ذکر کرتے رہے۔ غالباً دونوں گارڈن کالج راولپنڈی میں رفیقِ کار رہ چکے تھے۔

طیارے میں اپنی اپنی جگہ پر جا کے بیٹھے۔ میری نشست کھڑکی کے پاس تھی۔ میں نے باہر جھانکا۔ ماسکو کا ایرپورٹ جگمگا رہا تھا۔ میں نے ماحول پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور میری زبان پر بے اختیار یہ مصرع آیا

عمر تاں باد و نازاے ساقیانِ جام جم!

▲

(۲۳)

واپس جموں میں

طیارہ صبح کے (یعنی آدھی رات کے) ساڑھے بارہ بجے چلا۔ اعلان ہوا کہ دہلی کا سفر پونے چھ گھنٹے میں طے ہوگا۔

ابھی جہاز کو اڑے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اناؤنسر نے بتایا اس وقت ہندستان میں پونے چار بجے کا وقت ہے۔ یو ایس ایس آر کی سرحد ختم ہوتے ہی ہم غزنی کے اوپر سے گزریں گے۔ اس کے بعد پاکستان کا رخ کریں گے اور فورٹ سنڈیمن اور رحیم یار خاں کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے ہم لوگ ۹ بجے دہلی پہنچ جائیں گے۔ فورٹ سنڈیمن اور رحیم یار خاں کے ناموں نے دل میں جو تڑپ پیدا کی وہ لفظوں میں نہیں آ سکتی۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نیچے جھانکتا تھا لیکن رات کے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا بہر طور وقت کا اعلان سن کر ہم نے بھی اپنی گھڑیوں کو جو اس وقت سوا بجا رہی تھیں ڈھائی گھنٹے آگے کر دیا۔ وقت میں یہ تبدیلی کرتے ہی نیند آنکھوں سے غائب ہو گئی۔ میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نہ سو سکا۔ دوشنبہ سے لی ہوئی نیند کی دوا میرے پاس تھی۔ ایک گولی کھائی لیکن کرسی پر سونا چاہے وہ ایئر انڈیا کے طیارے کی آرام دہ کرسی ہی کیوں نہ ہو میرے لیے آسان کام نہیں۔ اور پھر فورٹ سنڈیمن اور رحیم یار خاں اور پاکستان کے دوسرے علاقوں کے لیے نیچے جھانکنا بھی نیند نہ آنے کا ایک سبب بنا۔ بہر کیف گولی نے سات بجے کے قریب اپنا اثر دکھایا۔ میری آنکھ لگی ہی تھی کہ ایر ہوسٹس نے جو شربت کا گلاس ہاتھ میں لیے ہوئے تھی جگا دیا۔ میں نے معذرت پیش کی اور پھر سو گیا لیکن شاید دس منٹ ہی بعد دوسری ایر ہوسٹس نے پورا ناشتہ لا کے میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے باتھ روم میں جا کے کلی کی۔ دانت صاف کیے اور ناشتے پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد نیند کہاں۔ گھڑی نے نو بجائے تو ہمارا طیارہ پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچ چکا تھا اور رن وے پر چل رہا تھا۔

طیارہ گاہ سے باہر آیا تو واسو دیوان جی انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی گاڑی لیے ہوئے موجود تھے۔ واسو دیوان جی بہت متواضع اور خوش اخلاق انسان ہیں ان سے مل کے مسرت ہوئی۔

چند لمحوں میں ہماری گاڑی ڈیفنس کالونی کی جانب رواں تھی جہاں ایک دن مالک رام صاحب کے یہاں قیام کرکے میں جموں روانہ ہو آیا۔

شعبۂ اردو،
جموں یونی ورسٹی،
جموں
۲۴ ستمبر ۱۹۷۶ء

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم مطبوعات

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم مطبوعات

کتاب	موضوع	مصنف	مرتب / مترجم / مصنف	قیمت
عجیب صاحب ـ احوال و افکار			مرتبہ: ضیاء الحسن فاروقی، آغا شہیر الحق، شہاب الدین انصاری، عبد اللطیف اعظمی	۹۰/=
حیاتِ عابد	(سوانح)		مرتبہ: ڈاکٹر صغرا مہدی	۴۵/=
اقبالیات کی تلاش	(ادب)		عبد القوی دسنوی	۳۵/=
نقدِ بجنوری	(ادب)		ڈاکٹر حدیقہ بیگم	۲۵/=
بالکلیات	(طنز و مزاح)		یوسف ناظم	۱۸/=
تلامذۂ غالب	(غالبیات)		مالک رام	۶۵/=
انتی گونی	(ڈراما)	سوفوکلیز	مترجم: قیصر زیدی	۹/=
اسلام دورِ حاضر میں	(منتخب مضامین)	ولفرڈ کینٹول اسمتھ	مرتبہ: پروفیسر مشیر الحق	۳۶/=
اسلامیات	(تحقیق)		مالک رام	۲۸/=
لفظوں کا آسمان	(شعری مجموعہ)	سیتا کانت مہاپاتر	مترجم: کرامت علی کرامت	۳۰/=
سلسلۂ روز و شب	(خود نوشت)		صالحہ عابد حسین	۶۵/=
دوہے	(شعری مجموعہ)		جمیل الدین عالی	۱۲/=
وجد: شاعر اور شخص	(ادب)		مرتبہ: یوسف ناظم	۲۵/=
عمرو بن العاص	(سوانح)		مولانا اسلم جیراجپوری	۶/=
آسان اردو	(تعلیم)		شکیل اختر فاروقی	۶/=
غبارِ کارواں	(سوانح)	بیگم انیس قدوائی	مرتبہ: پروفیسر انور صدیقی	۲۸/=
خوشتر چیزے دیگر است	(ادب)		عمیق حنفی	۲۸/=
خطباتِ عیدین	(خطبات)		محمد تقی امینی	۲۱/=
بچوں کا آرٹ	(آرٹ)		عبید الحق	۲۸/=
ادبی سماجیات	(ادب)		ڈاکٹر محمد حسن	۲۱/=
الفاظ کا مزاج	(ادب)		غلام ربانی (مرحوم)	۲۱/=
کلیاتِ عرش ملسیانی	(کلیات)		مرتبہ: مالک رام	۴۵/=
کہانی کے پانچ رنگ	(ادب)		شمیم حنفی	۲۲/=
تعلیم: نظریہ اور عمل	(تعلیم)		ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۹/=
علامتوں کا زوال	(ادب)		انتظار حسین	۳۹/=
شعورِ ادب	(انتخاب نثر و نظم)		مرتبہ: ادارہ	۱۸/=
برکت ایک چھینک کی	(مزاحیہ مضامین)		وجاہت علی سندیلوی	۱۵/=
عالم پناہ	(ناول)		رفیعہ منظور الامین	۴۰/=
اوراس برڈ	(ڈرامے)		ابراہیم یوسف	۱۲/=
نیلی ساری	(افسانے)		خواجہ احمد عباس	۱۲/=
مکتی بودھ	(افسانے)		راجندر سنگھ بیدی	۲۵/۵۰
حضرت جنید بغدادیؒ	(تصوف)		ضیاء الحسن فاروقی	۳۵/=
تقریر و تعبیر	(تقاریر)		محمد ہدایت اللہ	۱۵/=
فراق: شاعر و شخص	(ادب)		مرتبہ: شمیم حنفی	۳۵/=
معاصر ادب کے پیش رو	(تنقید)		ڈاکٹر محمد حسن	۳۰/=
ذکرِ خیر	(خاکے)		یوسف ناظم	۱۸/=

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی